راہ معرفت (8)

راہِ معرفت

حسینی تحریک میں
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عنصر

المہدیؑ ادارۂ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

المہدیؑ ادارۂ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

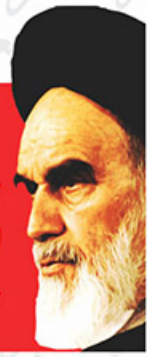

شہید مطہری اپنی پوری عمر اسلامِ عزیز کے مقدس اہداف کے حصول کی جدوجہد میں مصروف رہے، بے راہ رویوں اور انحرافات کے خلاف جانفشانی سے نبرد آزما ہوئے، شہید مطہری دین اسلام اور اس کے مختلف علوم میں تبحر اور قرآن حکیم کے حقائق و غوامض کی بصیرت و معرفت میں اپنی مثال آپ تھے، شہید مطہری میری عمر کا حاصل تھے۔

امام خمینیؒ

شہید مطہری انقلاب اسلامی کا فکری ستون ہیں اور انقلاب کی کامیابی بلکہ اس کو وجود میں لانے میں شہید مطہری کا بہت بڑا کردار رہا ہے اگر آج بھی آپ اسلام کے ترجمان بننا چاہیں اور دینی معارف کو سمجھنا چاہیں تو لازمی ہے کہ کم از کم ایک بار اُستاد مطہری کے تمام آثار اور کتب کا مطالعہ کریں۔

رہبر معظم سید علی خامنہ ایؒ

المہدیؑ ادارۂ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال رسول اللہ (ص): ان الحسین مصباح الھدیٰ و سفینۃ النجاۃ
حسینؑ ہدایت کا چراغ اور نجات کی کشتی ہے۔ (صراط مستقیم ج ۲ ص ۱۶۱)

حسین علیہ السلام ایک ایسا چراغ ہدایت ہے جو گمراہی کی تاریکی اور حق و باطل کی آمیزش کے دھندلکے میں ہدایت کے راستے کو روز روشن کی طرح عیاں کرتا ہے تاکہ ہر چشم بینا گوش شنوا اور بیدار ضمیر رکھنے والے انسان کے لئے اتمام حجت ہو سکے۔ حسینؑ ہر اس ملت اور قوم کے لئے کشتی نجات ہے جو ذلت کے پر تلاطم سمندر میں غرق ہو کر نابودی کے دہانے پر ہو۔ حسینؑ اسلام کی عزت اور دشمنان دین کی ذلت کا باعث ہے، حسینؑ رسالت کا آئینہ دار اور شمع رسالت کا محافظ ہے۔ حسینؑ اقدار الہیٰ کا احیاء کنندہ اور باطل کے ایوانوں کو لرزہ براندام کرنے والی ہستی ہے۔

حسینؑ ایک انسان ساز یونیورسٹی ہے جو تا ابد آزاد انسانوں کی تربیت کرتی رہے گی جو یزیدیت کے مقابلے میں بیعت کو ٹھکرا کر قد علم بلند کرتے رہیں گے اور یزیدیت کو ہر محاذ پر شکست دیتے رہیں گے۔ شہید مطہریؒ نے کربلا اور امام حسینؑ سے متعلق بہت سے پہلوؤں کو ذرا مختلف انداز سے کھولا ہے جو صاحبان عقل خرد کے لئے راہنما اصول ہیں۔ موجودہ کتابچہ انہیں کی چند تقاریر پر مشتمل ہے جو نوجوان نسل کے لئے کربلا شناسی کا بہترین منبع ہے۔

امام خمینیؒ نے اس عظیم فیلسوف اور عارف کے بارے میں فرمایا کہ: **"شہید مطہریؒ مجموعی طور پر اسلام و قرآن اور مختلف اسلامی علوم و فنون میں مہارت رکھنے والے اپنی نوعیت کی ممتاز شخصیت تھے۔ ان کی تمام تحریریں اور خطبات بغیر کسی استثناء کے آسان اور تعلیم و تربیت کرنے والی ہیں۔"**

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: **"دانشوروں اور یونیورسٹی کے طلباء کو چاہیے کہ وہ شہید مرتضیٰ**

مطہریؒ کی کتب پڑھنا ترک نہ کریں تا کہ اسلام دشمن سازشیں کامیاب نہ ہوں۔"

اسی طرح رہبر انقلاب اسلامی سید علی خامنہ ای (حفظہ اللہ) شہید مطہریؒ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"شہید مطہریؒ اسلامی جمہوریہ ایران کے فکری نظام کے بانی ہیں اور شہید مطہریؒ کا فکری راستہ ہی اسلام کے ان اصلی افکار کا بنیادی لائحہ عمل ہے جو دشمن قوتوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہے۔ بلاشبہ ایسا لائحہ عمل جو فکری اعتبار سے انقلاب کی حفاظت کر سکتا ہے۔ میری تاکید ہے کہ شہید کے آثار کو نظر انداز نہ کیا جائے ،ان کی کتابوں کو اپنے بحث و مباحثہ اور تبادلۂ خیال کا محور بنائیں اور انہیں صحیح انداز میں خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھائیں۔"

راہ معرفت کے نام سے شائع کیے جانے والے اس سلسلے کا ہدف یونیورسٹیز کے نوجوانوں اور معاشرے کے تعلیم یافتہ افراد تک اس اسلامی لائحہ عمل کو پہنچانا ہے تا کہ وہ اسلام ناب محمدیؐ کی حقیقی فکر اور قرآن وعترت کے مبانی سے آگاہی حاصل کر کے اپنی زندگیوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالیں اور معاشرہ میں اسلام شناس کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کر سکیں۔

انشاء اللہ مختلف موضوعات پر مشتمل کتابچوں کا یہ سلسلۂ "راہ معرفت" جاری رہے گا۔ ہم خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہیں کہ رب العزت ہم سب کو اس کاوش سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)۔

المہدیؑ ادارہ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

حسینی تحریک میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عنصر

اہداف:

۱۔ امام حسین علیہ السلام کے قیام کے عوامل کو بیان کرنا۔

۲۔ اس نتیجے تک پہنچنا کہ ان عوامل میں سے کونسا عامل کس حد تک اس تحریک میں دخالت رکھتا ہے۔

۳۔ حسینی تحریک میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے عنصر کی شناخت۔

۴۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی شرائط سے آشنائی۔

۵۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مراحل اور اقسام سے آشنائی۔

حسینی تحریک کے اصلی عناصر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمين ،باری الخلائق اجمعين ،الصلاة والسلام علی عبدالله ورسوله وحبيبه وصفيه ،سيدنا ونبينا ومولانا ابی القاسم محمد وآله الطيبين الطاهرين المعصومين اعوذ بالله من الشيطان الرجيم:

{إِنَّ اللهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ O التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ}۔

ترجمہ: یقیناً اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لیے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں، یہ توریت وانجیل اور قرآن میں ان کے ذمے پکا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنا عہد پورا کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ پس تم نے اللہ کے ساتھ جو سودا کیا ہے اس پر خوشی منا اور یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے۔☆

(یہ لوگ) توبہ کرنے والے، عبادت گزار، ثنا کرنے والے، (راہ خدا میں) سفر

کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کی دعوت دینے
والے اور برائی سے روکنے والے اور حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے ہیں اور
(اے رسول) مومنین کو خوشخبری سنا دیجیے۔ (توبہ/ ۱۱۱، ۱۱۲)

ہماری گفتگو تحریک حسینی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنصر کے بارے میں ہے اور گفتگو اس بارے میں ہے کہ کیا حسینی تحریک میں اس عنصر کا دخل رہا ہے یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں جن باتوں نے امام حسینؑ کو اس سفر اور تحریک پر مجبور کیا ان میں امر بالمعروف اور رنہی عن المنکر بھی شامل تھا یا نہیں ؟ دوسرے یہ کہ اس تحریک میں اس عنصر کا دخل کس حد تک ہے۔ اگر انسان کسی درس سے کچھ استفادہ حاصل کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ پہلے اسے سمجھے اور اس کو تحلیل کرے۔ آج میں ان تمام اصلی عناصر کے بارے میں جو حسینی تحریک پر اثر انداز رہے ہیں مختصر طور پر بحث کروں گا۔ اس کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں جو اس تحریک کا اصلی عنصر ہے زیادہ تفصیل اور تشریح کے ساتھ بحث کروگا۔

حسینی تحریک میں بہت سے عوامل کا دخل رہا ہے اور انہیں متعدد عوامل کے دخل کے سبب جو حادثہ باجود یہ کہ تاریخی اور سطحی واقعات کے لحاظ سے زیادہ طویل اور مفصل نہیں ہے، تفسیر کے لحاظ سے اور اس بڑے تاریخی واقعہ کی ماہیت کو درک کرنے کی نظر سے بہت زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس حادثے کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں اور کبھی کبھی اس عظیم حادثے سے غلط نتائج بھی نکالے گئے ہیں۔ اس داستان کی پیچیدگی کا ایک سبب یہ عناصر ہیں جو اس حادثہ کے وجود میں آنے پر اثر انداز ہوئے۔ ہمیں اس حادثہ میں بہت سے مسائل ملتے ہیں: ایک جگہ امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنا اور آپؑ کا بیعت سے انکار کرنا ہے۔ دوسری جگہ اہل کوفہ کا امامؑ کو دعوت دینا اور امامؑ کا ان کی دعوت قبول کرنا ہے۔ ایک اور مقام پر امامؑ بیعت مانگنے اور بیعت سے انکار کرنے کے مسئلے پر بالکل توجہ دیئے بغیر اور اس مسئلے پر بھی بنیادی توجہ دیئے بغیر کہ کوفہ والوں نے ان کی بیعت کرنا چاہی اور ان کو بلایا ہے یا نہیں بلایا، اس وقت کے حالات اور حکومت وقت پر تنقید کرتے ہیں، خرابیاں پیدا ہونے اور پھیلنے کا ذکر کرتے ہیں، اسلام کی حقیقت بدل جانے کا ذکر کرتے ہیں، حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دینے کا ذکر کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ ان حالات کے پیش نظر خاموش نہ بیٹھے۔ اس مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ امامؑ نہ بیعت کی بات کرتے ہیں اور نہ بلاوے کی، نہ اس بیعت کی بات کرتے ہیں جو یزید ان سے چاہتا ہے

اور نہ اس دعوت کا ذکر کرتے ہیں جو اہل کوفہ نے انہیں دی ہے۔ معاملہ ہے کیا؟ کیا یہ مسئلہ بیعت کا مسئلہ تھا؟ کیا یہ مسئلہ دعوت کا مسئلہ تھا؟ کیا یہ مسئلہ اعتراض، نکتہ چینی یا برائیاں پھیلنے کا مسئلہ تھا؟ ان میں سے کون سی بات تھی؟ ہم اس مسئلہ کی کس طرح توجیہ کریں؟ اس کے علاوہ امامؑ کے زمانے یعنی یزید کے دور حکومت اور پہلے کے ادوار میں کون سا واضح فرق تھا؟ خاص طور پر اس دور میں اور معاویہ کے دور میں کیا فرق تھا کہ جب امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کر لی تھی اور امام حسینؑ کے پاس یزید سے صلح کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اور نہ ایسی صلح کو جائز شمار کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حادثے میں ان تمام اسباب کا دخل اور اثر رہا ہے یعنی یہ سب عوامل موجود تھے اور امامؑ نے ان تمام عوامل کے مقابل اپنے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ امامؑ کے کچھ ردعمل اور عمل کی بنیاد یزید کی بیعت سے انکار پر ہے، امامؑ کے کچھ ارادے اور فیصلے کوفہ والوں کے بلاوے کی بنیاد پر قائم ہیں اور کچھ ان برائیوں اور خرابیوں کے خلاف جدوجہد کرنے پر مبنی ہیں اس وقت ہر تین صورتیں پائی جاتی تھیں۔

حادثہ کربلا میں جو اباعبداللہ علیہ السلام کی ذات گرامی کے ردعمل اور ارادوں اور فیصلوں کا مجموعہ ہے ان تمام عناصر کا دخل رہا ہے۔ ہم پہلے بیعت کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہیں کہ اس عمل کا کتنا دخل تھا؟ امامؑ نے بیعت طلبی کے سوال پر کیا ردعمل ظاہر کیا اور صرف بیعت طلبی امامؑ پر کون سا فریضہ عائد کرتی تھی؟

ہم سب جانتے ہیں کہ معاویہ ابن ابی سفیان حکومت اور خلافت پر کس طرح سے پہنچا۔ جب امام حسنؑ کے اصحاب نے کافی کمزوری دکھائی تو امام حسنؑ معاویہ سے ایک وقتی معاہدہ کر لیتے ہیں لیکن یہ معاہدہ عاویہ کی حکومت اور خلافت کیبنیاد پر نہیں تھا اس بنیاد پر تھا کہ اگر معاویہ حکومت کرنا چاہے تو ایک محدود مدت تک حکومت کرے اس کے بعد مسلمان اپنے اختیار سے جس کسی کو مناسب اور موزوں سمجھیں خلافت کے لئے منتخب کر لیں۔ دوسرے الفاظ میں اس شخص کی طرف رجوع کر لیں جو پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے مقرر اور متعین ہوا ہے۔ معاویہ کے دور تک حکومت اور خلافت کا مسئلہ موروثی نہیں تھا بلکہ یہ ایسا مسئلہ تھا جس کے متعلق صرف دو قسم کے خیالات پائے جاتے تھے۔ ایک خیال یہ تھا کہ صرف وہی شخص خلافت کا سزاوار تھا جسے پیغمبرؐ خدا نے خدا کے حکم سے منصوب کر دیا اور دوسرا طرز فکر یہ تھا کہ لوگوں کو خود اپنا خلیفہ چننے کا حق حاصل ہے۔

بہر حال یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ پچھلا خلیفہ اپنے بعد کے خلیفہ کا تعین لوگوں پر کر دے، اپنا جانشین مقرر کرے اور وہ پھر اپنا جانشین مقرر کرے اور یعنی پھر خلافت کا مسئلہ نہ پیغمبرؐ کے حکم کے دائرے میں رہے نہ مسلمانوں ہی کو اس کے انتخاب میں کوئی دخل باقی رہے۔ امام حسنؑ نے صلح نامے میں ایک شرط (جس پر معاویہ نے دوسری شرائط کی طرح صریحاً عمل نہیں کیا بلکہ امام حسنؑ کو زہر دلوایا کر شہید کر دیا تا کہ نہ مدعی رہے نہ دعویٰ) یہ رکھوائی تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کوئی حق نہ ہوگا مسلمانوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے، خود تو دنیائے اسلام کے لئے جتنی مصیبت ہے وہ ہے لیکن بعد میں اختیار مسلمانوں کو ہوگا بہر حال معاویہ کو اختیار نہیں ہوگا، لیکن معاویہ کا پختہ ارادہ پہلے ہی دن سے یہ تھا کہ خلافت کو اپنے خاندان سے باہر نہ جانے دے اور مئورخین کے قول کے مطابق ایسا کام کرے کہ خلافت کو سلطنت کی شکل دیدے لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اس کام کیلئے فی الحال فضا سازگار نہیں ہے۔ وہ اس بارے میں بہت کچھ سوچتا تھا اور اپنے خاص دوستوں سے بھی مشورہ کرتا رہتا تھا لیکن ظاہر کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا اور یہ سوچ نہیں پاتا تھا کہ یہ بات عمل میں بھی آسکتی ہے۔

جیسا کہ مئورخین نے لکھا ہے وہ شخص جس نے اسے اس کام کی ہمت بندھائی اور اسے اطمینان دلایا کہ یہ بات عمل میں بھی آسکتی ہے مغیرہ بن شعبہ تھا۔ اسے حکومت کوفہ کا لالچ تھا کیونکہ وہ پہلے کوفہ کا حاکم اور والی رہ چکا تھا اور چونکہ معاویہ نے اسے برخاست کر دیا تھا اس لئے ناراض تھا وہ شام پہنچا۔ وہ بڑا نقاش اور زیرک عرب کا دیہاتی تھا، اس نے اس غرض سے کہ دوبارہ کوفہ کی حکومت حاصل ہو جائے اس طرح اسکیم بنائی۔ ایک دن اس نے یزید بن معاویہ کو دیکھا تو بولا نہ جانے معاویہ تیرے بارے میں کیوں کوتاہی کر رہا ہے، دیر کس بات کی ہے؟ لوگوں کے سامنے تجھے اپنے جانشین کی حیثیت سے پیش کیوں نہیں کرتا؟ اس نے جواب دیا: میرا باپ سوچتا ہے کہ یہ بات ناقابل عمل ہے۔ اس نے کہا: نہیں قابل عمل ہے تمہیں کس طرف سے خوف ہے؟ تمہارے خیال میں کس جگہ کے لوگ عمل نہیں کریں گے؟ جو کچھ معاویہ کہے گا شام والے اس کی اطاعت کریں گے، ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے، رہے مدینہ والے تو اگر فلاں کو تم وہاں بھیج دو تو وہ یہ کام انجام دے گا۔ عراق (کوفہ) البتہ سب مقامات سے زیادہ اہم اور خطرناک ہے وہاں کا کام میں انجام دے سکتا ہوں۔

یزید معاویہ کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مغیرہ نے یہ بات کہی ہے۔ معاویہ مغیرہ کو بلاتا ہے

۔اس نے اپنی چرب زبانی اور پختہ دلیلوں سے معاویہ کو مطمئن کر دیا کہ فضا سازگار ہے اور کوفہ کا کام جو سب جگہوں سے زیادہ سخت اور زیادہ مشکل ہے وہ میں انجام دے دوں گا۔معاویہ نے اسے دوبارہ حکم دیا کہ کوفہ چلا جائے (البتہ یہ واقعہ حضرت امام حسنؑ کی وفات کے بعد اور معاویہ کے آخر عمر کا ہے)واقعات یہ ہیں ۔کوفہ اور مدینہ والوں نے یہ بات قبول نہیں کی معاویہ مجبور ہوا کہ مدینہ جائے ،مدینہ کے رؤسا یعنی ان لوگوں کو جن کی پبلک میں عزت تھی مثلاً حضرت امام حسینؑ،عبداللہ ابن زبیر،اور عبداللہ ابن عمر کو بلایا اپنی چرب زبانی سے کوشش کی کہ اسلامی مصلحت کے خیال سے فی الحال اس طرح منظور کر لیں کہ ظاہری حکومت یزید کے ہاتھ میں رہے لیکن کام سب آپ کے اختیار میں ہوتا کہ لوگوں میں کوئی اختلاف نہ ہو،آپ لوگ فی الحال بیعت کر لیجئے ،عملی طور پر حکومت کی باگ ڈور آپ ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی ۔اس نے ان لوگوں کو مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے منظور نہیں کیا ،یہ کام بھی اس طریقے سے جیسے معاویہ چاہتا تھا عمل میں نہیں آسکا،پھر چالاکی سے مدینہ کی مسجد میں یہ چاہا کہ لوگوں کے سامنے یوں ظاہر کرے کہ یہ لوگ حاضر ہو گئے تھے اور انہوں نے قبول کر لیا تھا لیکن یہ چالاکی بھی کام نہیں دے سکی۔

معاویہ مرتے وقت اپنے بیٹے یزید کے طور طریق سے بہت پریشان تھا۔اس نے اسے نصیحت کی کہ بیعت لینے کے لئے عبداللہ ابن زبیر کے ساتھ اس طرح پیش آنا ،عبداللہ ابن عمر کے ساتھ اس طرح عمل کرنا ،امام حسینؑ سے یوں سلوک کرنا،اس نے خاص طور پر یہ حکم دیا کہ امام حسینؑ سے بہت محبت اور نرمی کا برتاؤ کرنا ،اس نے کہا کہ وہ پیغمبر خداؐ کے فرزند ہیں،مسلمانوں میں عظیم مرتبے کے مالک ہیں ۔اسے اس مرتبے کا ڈر تھا کہ امام حسینؑ سے سخت رویہ رکھے اور اپنے ہاتھ ان کے خون میں نہ رنگے کیونکہ پھر تو خلافت نہیں کر سکے گا بلکہ خلافت ابوسفیان کے خاندان سے ہی نکل جائے گی ،معاویہ بہت ہوشیار اور چالاک تھا،وہ ہر ماہر سیاست دان کی طرح حالات کو پہلے سے خوب بھانپ لیتا تھا یعنی خوب سمجھتا تھا اور خوب پہلے سے اندازہ لگا لیتا تھا۔اس کے برعکس یزید اول تو جوان تھا دوسرے ایسا شخص تھا جو شروع ہی سے ریاست اور شہزادگی کی حالت میں پلا بڑھا تھا،کھیل تماشوں سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا ،سیاست کو واقعاً نہیں سمجھتا تھا،جوانی اور ریاست کا غرور تھا،دولت اور شہوت کا غرور تھا۔اس نے وہ کام کیا جس نے سب سے زیادہ نقصان ابوسفیان کے خاندان کو پہنچایا اور اس معاملے میں سب سے زیادہ

اسی خاندان کی شکست ہوئی ،ان لوگوں کا کوئی روحانی مقصد تو تھا نہیں ۔ یہ سلطنت اور حکومت کے سوا دوسری چیز سے غرض نہیں رکھتے تھے اور اسے بھی ہاتھ سے دیدیا ۔امام حسینؑ قتل تو ہوئے لیکن اپنے روحانی ہدف تک پہنچ گئے جبکہ ابوسفیان کا خاندان کسی طرح اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکا۔

نصف ماہ رجب ۶۰ ہجری میں جب معاویہ مرجاتا ہے تو یزید مدینہ کے حاکم کو، جو بنی امیہ ہی سے تھا ایک خط لکھتا ہے جس میں معاویہ کے مرنے کی خبر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ لوگوں سے میرے لئے بیعت لو۔ وہ جانتا تھا کہ مدینہ مرکز ہے اور سب کی نگاہیں مدینہ کر طرف لگی ہوئی ہیں ،وہ اپنے ایک خصوصی خط میں سختی سے حکم صادر کرتا ہے کہ امام حسینؑ کو بلا کر ان سے بیعت لے اور اگر وہ بیعت نہ کریں تو ان کا سر اس کے پاس بھیج دے چنانچہ امام حسینؑ کو جو بات درپیش تھی وہ یزید بن معاویہ کی اسی بیعت کا تقاضا تھا جس میں دیگر برائیاں ایسی تھیں جو معاویہ کے معاملے میں بھی موجود نہیں تھیں ۔ایک یہ کہ یزید کی بیعت امام حسینؑ کی طرف سے موروثی خلافت کی توثیق ہوجاتی یعنی خلافت کا مسئلہ انفرادی مسئلہ نہ رہتا بلکہ خلافت موروثی ہوجاتی۔

دوسرا موضوع خود یزید کی شخصیت تھی جو اس زمانے کے طور طریق کو ہر دوسرے ادوار کے حالات سے الگ امتیاز دے رہا تھا۔ وہ صرف فاسق اور فاجر گزرے لیکن وہ ایک بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے ،وہ جانتے تھے کہ اگر وہ اپنا ملک اور حکومت باقی رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں زیادہ سے زیادہ اسلامی مصلحتوں کا خیال رکھنا چاہیے، اسلامی مظاہر کی زیادہ حفاظت کرنا چاہیے، وہ سمجھتے تھے کہ اگر اسلام نہ رہا تو وہ بھی نہیں ہوں گے، وہ جانتے تھے کہ ایشیاء افریقہ اور یورپ کی مختلف نسلوں کے کروڑوں افراد ایک حکومت کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے ہیں اور شام یا بغداد کی حکومت کی پیروی کرتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں، قرآن پر عقیدہ رکھتے ہیں اور خلیفہ کو بہر حال اسلامی خلیفہ جانتے ہیں بصورت دیگر جس دن انہیں یہ احساس ہوگیا کہ خلیفہ خود اسلام سے منہ پھیر چکا ہے اور اس کے خلاف عمل کرتا ہے وہ بھی خلیفہ سے بغاوت کردیں گے۔

آخر کیا لازم تھا کہ خراسان ،شام ،سوریہ اور افریقہ کے ایک حصے کے باشندے بغداد یا شام کے حاکم کی اطاعت کریں اور کوئی سبب نہیں تھا لہٰذا جو عقلمند، سمجھدار اور سیاست دان خلفاء تھے وہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ وہ اسلام کی مصلحتوں کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے پر مجبور ہیں لیکن یزید بن معاویہ کو

اس کا بھی شعور نہیں تھا، بدزبان انسان تھا، دوسروں کی توہین کیا کرتا تھا، اسے اچھا لگتا تھا کہ مسلمانوں اور اسلام سے بے اعتنائی برتے، اسلامی حدود کو توڑے۔ یہ شخص عام مجالس میں کھلم کھلا شراب پیتا تھا، نشے میں دھت ہو جاتا تھا اور پھر بیہودہ بکواس شروع کر دیتا تھا یہ بندر کو بہت پسند کرتا تھا چونکہ اس کی ماں بدو عورت تھی اور یہ خود بھی صحرا میں پلا بڑھا تھا اس میں بھی بدوی اخلاق پیدا ہو گئے تھے، کتوں اور بندروں سے خصوصی رغبت اور دلچسپی رکھتا تھا۔

مسعودی اپنی کتاب "مروج الذهب" میں لکھتا ہے: یہ بندر کو خوشنما ریشمی کپڑے پہناتا تھا اور اپنے برابر ملکی اور فوجی افسروں سے بلند جگہ پر بٹھاتا تھا یہی وجہ ہے جو امام حسینؑ نے فرمایا تھا :"وعلى الاسلام السلام اذقد بليت الامة براع مثل يزيد" اس میں اور دوسروں میں فرق تھا۔ یہ شخص دراصل اسلام کے خلاف تبلیغ کرتا تھا، ایسے شخص کی بیعت امام حسینؑ سے طلب کر رہے تھے۔ امامؑ نے بیعت سے انکار کیا اور فرمایا: "میں کسی صورت بیعت نہیں کروں گا" ادھر وہ لوگ بھی کسی طرح بیعت طلبی سے صرف نظر نہیں کر رہے تھے یہ ایک سبب اور واقعہ تھا۔ ان لوگوں کا یہ سخت مطالبہ کہ ہم تم جیسی شخصیت کو بیعت لئے بغیر نہیں چھوڑیں گے، ایک ایسا شخص جو بیعت نہیں کرتا اور یہ کہتا ہے کہ اس حکومت کی جانب سے مجھ پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا، مجھے اس پر اعتراض ہے۔ وہ لوگ کسی طرح اس کے لئے تیار نہیں تھے کہ امام حسینؑ بیعت نہ کریں اور آزادی کے ساتھ بے روک ٹوک عوام سے ملیں جلیں۔ یہ لوگ اس بیعت نہ کرنے کو اپنی حکومت کے لئے خطرہ سمجھتے تھے، وہ اچھی طرح جان گئے تھے اور بات بھی یہی تھی۔ امام کا بیعت نہ کرنا یعنی معترض ہونا، منظور نہ کرنا، یزید کی اطاعت کو لازم نہ گردانا بلکہ اس کی مخالفت کو واجب جاننا وہ لوگ مصر تھے کہ آپؑ بیعت کیجئے۔ امامؑ فرماتے تھے کہ میں بیعت نہیں کروں گا اب اس تقاضے کے پیش نظر، ان اسباب کو دیکھتے ہوئے امام کا کیا فرض ہے؟ ایک مخالفت کے اقدام کے سوا اور کوئی عمل نہیں ہو سکتا، میں بیعت نہیں کروں گا، دوسری کوئی بات نہیں ہو سکتی کیا آپ بیعت کرتے ہیں؟ نہیں! اگر بیعت نہیں کرتے تو قتل کر دئے جائیں گے! میں قتل ہونے کو تیار ہوں لیکن بیعت نہیں کروں گا اس مقام پر امامؑ کا جواب فقط ایک "نہیں" ہے۔

مدینہ کے حاکم نے امام حسینؑ کو بلوایا، وہ بنی امیہ کا ایک فرد تھا (یہ بات ضرور کہنا چاہیے کہ اگرچہ قریب قریب تمام بنی امیہ ناپاک عنصر تھے لیکن یہ شخص ایک حد تک دوسروں سے مختلف تھا) اس وقت

امام حسینؑ مدینہ کی مسجد (مسجد نبوی) میں تشریف فرما تھے، عبداللہ ابن زبیر بھی آپ کے پاس تھے۔

حاکم کے گماشتہ نے دونوں کو حاکم کے پاس چلنے کی دعوت دی اور کہا کہ حاکم آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں، ان لوگوں نے کہا: تم جاؤ ہم بعد میں آجائیں گے۔ عبداللہ ابن زبیر بولے: اس موقع پر جو حاکم نے ہم لوگوں کو بلایا ہے آپ کا کیا اندازہ ہے؟ امامؑ نے فرمایا: میرا خیال ہے معاویہ مر گیا ہے اور ہمیں بیعت کیلئے بلایا ہے۔ عبداللہ ابن زبیر نے کہا: آپ نے خوب اندازہ لگایا، میرا بھی خیال یہی ہے، اب کیا کریں گے؟ امامؑ نے فرمایا: میں جارہا ہوں تم کیا کروگے؟ یہ میں بعد میں دیکھوں گا۔ عبداللہ ابن زبیر راتوں رات غیر معروف راستے سے ہوتے ہوئے بھاگ کر مکہ پہنچا اور وہاں پناہ گزیں ہوگیا۔ امامؑ گئے اور بنی ہاشم کے کچھ جوانوں کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ آپؑ نے ان سے فرمایا کہ تم باہر کھڑے رہنا، اگر میری آواز بلند ہو تو تم اندر گھس آنا لیکن جب تک میری آواز بلند نہ تو اندر نہ آنا۔ ناپاک بدنام زمانہ اموی مروان بن حکم بھی جو کبھی مدینہ کا حاکم رہ چکا تھا وہاں موجود تھا۔ حاکم نے کھلا ہوا خط امامؑ کو سنایا۔ امامؑ نے فرمایا: کیا چاہتے ہو؟ حاکم نے چرب زبانی باتیں شروع کیں کہ لوگوں نے یزید کی بیعت کرلی ہے، معاویہ کی یہی خواہش تھی اور اسلام کی بھلائی بھی اسی میں ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپؑ بھی بیعت کرلیں، اسلام کی بھلائی کا یہی تقاضا ہے بعد میں آپ جس طرح فرمائیں گے اس پر عمل کیا جائے گا، تمام خرابیاں دور کردی جائیں گی۔ امامؑ نے فرمایا: تم مجھ سے کس لئے بیعت چاہتے ہو؟ لوگوں سے بیعت لینے کے لئے بیعت چاہتے ہو یعنی خدا کے لئے نہیں چاہتے، اس لحاظ سے کہ خواہ خلافت شرعی ہے یا غیر شرعی میں بیعت کرلوں تاکہ شرعی ہوجائے، یونہی ہے؟ تم میری بیعت اس لئے چاہتے ہو کہ دوسرے لوگ بھی بیعت کرلیں۔ اس نے کہا: ہاں! آپؑ نے فرمایا: تو اس خالی کمرے میں جہاں صرف ہم تین شخص ہیں تم کو میری بیعت سے کیا فائدہ ہوگا؟ حاکم نے کہا: آپ درست فرمارہے ہیں، یہ تو پھر بعد میں ہوگی۔ امامؑ نے فرمایا: مجھے جانا چاہیے۔ حاکم نے کہا: بہت بہتر، تشریف لے جائیں۔ مروان بن حکم بولا: کیا کہہ رہے ہو کہ چلے جائیں؟ اگر یہ یہاں سے چلے گئے تو کیا بیعت کریں گے؟ خلیفہ کے حکم کی تعمیل کرو امامؑ نے مروان کا گریبان پکڑ کر اسے اوپر اٹھا کر پھر زمین پر زور سے دے مارا اور فرمایا: تو نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر بات کی۔

امامؑ باہر تشریف لے گئے اور اس کے بعد تین راتوں تک مدینہ ہی میں رہے۔ راتوں کو پیغمبر

اکرمؐ کی قبر پر تشریف لے جاتے تھے اور وہاں دعا مانگتے تھے۔اے خدا! مجھے وہ راستہ دکھا جس میں تیری رضا ہو۔تیسری رات کو امامؑ پیغمبر اکرمؐ کی قبر پر جاتے ہیں اور بہت روتے ہیں وہیں آپ کی آنکھ لگ جاتی ہے،خواب میں پیغمبر اکرمؐ کو دیکھتے ہیں۔یہ خواب آپؑ کے لئے الہام اور وحی کا درجہ رکھتا تھا۔ حضرت امام حسینؑ اس کے دوسرے روز مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے اور راستے سے بچ کر نہیں بلکہ اسی عام راستے سے مکہ کی طرف چل دیئے بعض ساتھیوں نے عرض کیا:

"یاابن رسول اللہ لوتنکبت الطریق

"بہتر

ہے کہ آپ شاہراہ سے نہ جائیں ممکن ہے کہ حکومت کے کارندے آپ کو واپس کر دیں،روکیں،لڑائی جھگڑا ہو جائے (ایک بہادر اور قوی روح ایسا کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہوتی) آپؑ نے فرمایا:میں پسند نہیں کرتا کہ ایک فرار ہونے کی شکل اختیار کروں،میں اسی شاہراہ سے جا رہا ہوں جو خدا چاہے گا وہی ہوگا۔

پہلا ___ سبب بیعت کا مسئلہ:

بہر حال حسینی حادثہ کا پہلا مسئلہ اور پہلا سبب جس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا" بیعت کا مسئلہ" ہے یزید کی بیعت جو تاریخ کی صحیح شہادت کے مطابق امام حسینؑ سے طلب کی گئی۔یزید خصوصی خط میں یوں لکھتا ہے:

"خذ الحسین بالبیعة اخذا

"امام

حسینؑ کو بیعت کرنے کے لئے گرفتار کرو،سختی کرو اور وہ جب تک بیعت نہ کریں رہا نہ کرو۔امام حسینؑ نے بھی پامردی سے اس مطالبے کی نفی کی اور کسی طرح یزید کی بیعت کے لئے تیار نہیں تھے،ان کا جواب صرف انکار تھا یہاں تک کہ امام حسینؑ کی عمر کے آخری دن میں جب امام حسینؑ کربلا میں تھے عمر بن سعد آیا اور اس نے امام حسینؑ سے مذاکرات کئے۔بظاہر اس کا انداز یہ تھا کہ وہ امام حسینؑ کو یزید سے صلح پر مجبور کرے لیکن حقیقت میں یہ صلح بیعت کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی امام حسینؑ تیار نہیں ہوئے۔امام حسینؑ کی ان باتوں سے جو آپ نے عاشور کے دن کہی ہیں پورے طور پر ظاہر ہے کہ آپؑ اپنے پہلے دن کے

ہی قول پر قائم تھے" لا واللہ لا اعطیکم بیدی اعطاء الذلیل و لا افر فرار العبید" (نہیں خدا کی قسم میں اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہرگز نہیں دوں گا، میں یزید کی بیعت ہرگز نہیں کروں گا) یہاں تک کہ ان حالات میں بھی جو آج ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ قتل کر دیا جاؤں گا اور دیکھ رہا ہوں اپنے عزیزوں کا قتل دوستوں کا قتل، اور اپنے خاندان کی اسیری ___ مگر یزید کی بیعت کرنے کو تیار نہیں ہوں گا۔ یہ سبب کب پیدا ہوا؟ معاویہ کے آخری زمانہ میں معاویہ کے مرنے کے بعد جب یزید کو حکومت ملی اس میں سختی اور عجلت بڑھی۔

دوسرا سبب۔ مسئلہ دعوت:

دوسرا سبب مسئلہ دعوت کا مسئلہ تھا۔ شاید بعض کتابوں میں آپ نے پڑھا ہوگا، لکھتے ہیں کہ سنہ ۶۰ ہجری میں معاویہ مر گیا تو کوفہ والوں نے امام حسینؑ کو بلایا تا کہ آپؑ کو خلیفہ منتخب کر لیں، امام حسینؑ کوفہ آئے کوفہ والوں نے غداری اور بے وفائی کی آپؑ کی مدد نہیں کی، امام حسینؑ قتل ہو گئے۔ انسان جب یہ تاریخیں پڑھتا ہے تو سوچنے لگتا ہے کہ امام حسینؑ رجب کے آخر میں جو یزید کی حکومت کا آغاز تھا بیعت سے انکار کے لئے مدینہ سے نکل گئے اور چونکہ مکہ خدا کی جانب سے جائے پناہ ہے اور وہاں دوسرے مقامات کے مقابلے میں امن کا زیادہ امکان ہے اس لئے آپ وہاں چلے جاتے ہیں۔ (معاویہ کو مرے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے اور شاید ابھی اس کی موت کی خبر کوفہ میں نہیں پہنچی تھی) نہ صرف اس لئے کہ وہ بہتر پناہ گاہ ہے بلکہ اس لئے کہ وہ لوگوں کے اکٹھے ہونے کا بہتر مرکز ہے۔

رجب شعبان کے مہینوں میں عمرہ کے ایام ہوتے ہیں لوگ چاروں طرف سے مکہ آتے ہیں اور ان کو بہتر طور پر تعلیم اور معلومات فراہم کی جاسکتی ہے۔ پھر حج کا زمانہ آجاتا ہے جو تبلیغ کے لئے زیادہ موزوں اور مناسب وقت ہوتا ہے، تقریباً دو ماہ کے بعد کوفہ والوں کے خطوط پہنچتے ہیں، کوفہ والوں کے خطوط مدینہ میں نہیں آئے ہیں جب کہ امام حسینؑ نے اپنی تحریک مدینہ سے شروع کر دی ہے۔ کوفیوں کے خطوط مکہ میں امام حسینؑ کے پاس پہنچتے ہیں یعنی اس وقت جب امام حسینؑ بیعت سے انکار کرنے کا عزم مصمم کر چکے تھے اور اسی عزم نے ان کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ پیدا کر دیا تھا (خود امامؑ اور دوسرے سبھی یہ بات جانتے تھے کہ نہ وہ لوگ بیعت لینے کے مطالبے سے دستبردار ہو سکتے ہیں اور نہ امامؑ

ہی بیعت پر آمادہ ہو سکتے ہیں)اس لئے کوفیوں کی دعوت اس تحریک کا اصلی سبب نہیں تھا بلکہ ثانوی سبب تھا البتہ کوفیوں کی دعوت کا زیادہ سے زیادہ اثر یہ مانا جا سکتا ہے کہ اس بلاوے نے لوگوں کے نقطہ نظر اور تاریخ کے فیصلے کے مطابق مستقبل میں امامؑ کے لئے بظاہر ایک مناسب موقع فراہم کر دیا۔

کوفہ ایک بڑا صوبہ اور اسلام کا فوجی مرکز تھا یہ شہر جو حضرت عمر بن خطاب کے زمانے میں بسایا گیا تھا ،ایک فوجی چھاؤنی تھا یہ امر اسلامی ممالک کی تقدیر پر بہت گہرا اثر رکھتا تھا ۔اگر کوفی اپنے وعدے پر قائم رہتے تو ممکن تھا کہ امام حسینؑ کامیاب ہو جاتے ۔

اس وقت کے کوفہ کا اس وقت کے مدینہ یا مکہ سے موازنہ نہیں ہوسکتا ،اس وقت کے خراسان سے بھی موازنہ نہیں ہوسکتا ــــــ اس کا مدمقابل فقط شام تھا۔کوفیوں کی دعوت کا اثر زیادہ سے زیادہ اس تحریک کی شکل میں ہوسکتا تھا کہ امام حسینؑ مکہ سے روانہ ہو جائیں اور اسے مرکز نہ بنائیں (بلاشبہ خود مکہ میں بھی ایسی دشواریاں تھیں کہ اسے مرکز نہیں بنایا جا سکتا تھا)ابن عباس کی بھی یہ تجویز کہ یمن چلے جائیں اور وہاں کے کوہستان میں پناہ لیں قبول نہیں کرتے ،اپنے نانا کے مدینہ کو بھی مرکز نہیں بناتے بلکہ کوفہ چلے آئیں ۔پس کوفیوں کے بلاوے کا دخل ایک ثانوی امر تھا کہ یہ عراق میں تحریک اور قیام کی صورت میں ہوتا ورنہ یہ اصلی سبب نہیں تھا۔

امامؑ جس وقت کوفہ کی سرحد کو پہنچتے ہیں جناب حر کے لشکر کا سامنا ہوتا ہے۔آپ کوفہ والوں سے فرماتے ہیں :تم نے مجھے بلایا ،اب اگر تم چاہتے تو لوٹ جاتا ہوں ۔اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں لوٹ جاتا ہوں اور یزید کی بیعت کئے لیتا ہوں اور ان تمام باتوں سے چشم پوشی کئے لیتا ہوں جو میں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ،ملک میں فسادات کے پھیلاؤ اور ان حالات میں مسلمانوں کے فرائض کے بارے میں کہی ہیں ،بیعت کر کے اپنے گھر میں خاموش بیٹھ جاتا ہوں اور سکوت اختیار کر لیتا ہوں ۔نہیں ! میں اس حکومت کو صالح نہیں سمجھتا اور اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری پر بھی قائم ہوں ۔تم اہل کوفہ نے مجھے دعوت دی ،تم نے کہا اے حسینؑ ! آپ کے پیش نظر ہدف کے حصول میں ہم آپ کی مدد کریں گے ،اگر تم بیعت نہیں کرتے تو نہ کرو ،امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نقطہ نظر سے تمہیں اس حکومت پر اعتراض ہے اور اس کے خلاف قیام کیا ہے تو ہم تمہارا ساتھ دیں گے ،میں بھی ایسے ہی لوگوں کی تلاش میں آیا ہوں جنہوں نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے ۔اب تم کہتے ہو کہ اہل کوفہ اپنے وعدے پر عمل نہیں کر

رہے ہیں تو بہت اچھا، ہم بھی کوفہ نہیں جاتے۔ ہم اس جگہ واپس جاتے ہیں جو ہمارا اصلی مرکز ہے، ہم مدینہ یا مکہ چلے جاتے ہیں۔ دیکھیں خدا کیا چاہتا ہے؟ بہرحال ہم بیعت نہیں کریں گے اگرچہ بیعت نہ کرنے پر ہم قتل ہی کیوں نہ ہو جائیں چنانچہ اس سبب یعنی کوفیوں کے بلاوے کا زیادہ سے زیادہ دخل اتنا تھا کہ انہوں نے امامؑ کو مکہ سے باہر نکالا اور وہ کوفہ کی طرف چل پڑے۔

یہ تو میں نہیں کہنا چاہتا کہ واقعی یہ لوگ اگر نہ بلاتے تو امامؑ قطعی طور پر مدینہ یا مکہ ہی رہتے نہیں! تاریخ بتاتی ہے کہ امامؑ اس سے معذور تھے، کوفہ کے مقابلے میں مکہ کے بھی ظاہری حالات کچھ بہتر نہیں تھے تاریخ میں بہت سے قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ بیعت نہ کرنے کی صورت میں امامؑ کو حج کے زمانے ہی میں قتل کر ڈالیں۔ صرف طریحی کا بیان ہی نہیں ہے بلکہ اوروں نے بھی بیان کیا ہے کہ امامؑ کو یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ اگر وہ حج کے زمانے میں مکہ میں رہ گئے تو ممکن ہے کہ اسی احرام کی حالت میں جب کوئی اصولاً ہتھیار بند نہیں ہوتا بنی امیہ کے ہتھیار بند کارندے ان کا خون بہا دیں اور خانہ کعبہ کی بے حرمتی ہو جائے۔ حج کی توہین ہو اور اسلام کی بے حرمتی ہو، دوہری بے حرمتی ہو، فرزند پیغمبرؐ عبادت کی حالت میں خانہ خدا کی چار دیواری میں قتل بھی کر دیئے جائیں اور ان کا خون رائیگاں بھی جائے ___ بعد میں وہ یہ مشہور کر دیں کہ امام حسینؑ کا فلاں شخص سے معمولی جھگڑا ہو گیا تھا، اس نے حضرت کو قتل کر دیا اور خود روپوش ہو گیا نتیجہ یہ نکلے کہ امامؑ کا خون ضائع ہو جائے۔ امامؑ نے اپنے ارشادات میں اس موضوع کے متعلق اشارہ بھی کیا ہے۔ اثنائے سفر میں کسی نے امامؑ سے پوچھا: آپ کس لئے نکل کھڑے ہوئے؟ اس کی مراد یہ تھی کہ آپ مدینہ میں محفوظ تھے، وہاں اپنے جد کے حرم یعنی پیغمبرؐ کی قبر کے پہلو میں کوئی شخص آپ سے تعرض نہیں کر سکتا تھا یا آپ مکہ میں ہی رہتے جہاں آپ خدا کے گھر کے قریب تھے، اب جو آپ وہاں سے باہر نکل آئے تو گویا آپ نے خود ہی خطرہ مول لے لیا ہے! آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: تم کو دھوکا ہوا ہے چاہے کسی بل میں بھی چھپ جاؤں یہ لوگ مجھے نہیں چھوڑیں گے جب تک میرا خون نہیں بہا لیں گے، میرے اور ان کے درمیان نہ ختم ہونے والا جھگڑا ہے۔ وہ مجھ سے ایسی بات کے طالب ہیں جس کے لئے میں کسی طرح آمادہ نہیں ہوں اور میں بھی ایسی بات کا خواہاں ہوں جسے وہ کسی طرح قبول نہیں کریں گے۔

تیسرا سبب۔امر بالمعروف کا مسئلہ:

تیسرا سبب امر بالمعروف ہے۔یہ بھی خود امامؑ کے کلام کا صریحی اظہار ہے،تاریخ لکھتی ہے :امامؑ کے بھائی محمد حنفیہ کا اس وقت ہاتھ مفلوج ہو چکا تھا،بیکار ہو گیا تھا۔آپ جہاد کے قابل نہیں تھے لہٰذا آپ نے شرکت نہیں کی ۔امامؑ ایک وصیت نامہ لکھ کر ان ک سپرد فرماتے ہیں:" **هذا ما وصى به الحسين بن على اخاه محمد االمعروف بابن حنفيه**" اس مقام پر امامؑ کے جملے ہیں: حسینؑ خدا کی یکتائی اور پیغمبرؐ کی رسالت پر گواہی دیتا ہے(کیونکہ امامؑ جانتے تھے کہ بعد میں کچھ لوگ یہ کہہ دیں گے کہ امام حسینؑ اپنے نانا کے دین سے خارج ہو گئے تھے)یہاں تک کہ آپؑ اپنے قیام کا راز بیان فرماتے ہیں:

> **"انى ماخرجت اشرا ولا بطرا ولا مفسدا ولا ظالما انما خرجت لطلب الاصلاح فى امة جدى اريد ان امر بالمعروف وانهى عن المنكر واسير بسيرة جدى وابى على ابن ابى طالب** عليه السلام"

اب یہاں اہل کوفہ کی دعوت کی کوئی بات ہی نہیں ہے یہاں تک کہ بیعت سے انکار کا بھی ذکر نہیں کرتے یعنی طلب بیعت اور بیعت سے انکار کے علاوہ ایک اور مسئلہ ہے ۔اگر یہ لوگ مجھ سے بیعت نہ بھی چاہیں تب بھی میں خاموش نہیں بیٹھوں گا ،دنیا والے جان لیں :"**ماخرجت اشرا ولا بطرا**

بن علیؑ کوئی جاہ طلب نہیں تھے،منصب اور دولت کے طالب نہیں تھے،فسادی اور تخریب کار بھی نہیں تھے ،نہ ظالم اور ستمگر تھے ،وہ ایک مصلح انسان تھے :"**ولا مفسدا ولا ظالما انما خرجت لطلب الا صلاح فى امة جدى**.....۔"

"الا وان الدعى بن الدعى قد ركزبين السلة والذلة وهيهات من الذلة يابى الله ذالك لناورسوله والمومنون وحجور طابت وطهرت"

اس ناہنجار کے بیٹے ہنجار(ابن زیاد) نے مجھے دو کاموں کے درمیان لا کھڑا کیا ہے کہ ان میں سے ایک کام کو اختیار کرلوں ،یا لڑوں یا ذلیل ہوجاؤں ۔ میں ہرگز ذلت برداشت نہیں کروں گا ۔اللہ تعالیٰ نے ذلت کو ہم سے اپنے رسول سے اور مومنین دور رکھ کر ان کو پاک و پاکیزہ بنایا ہے۔

پہلے دن سے آخری لحظہ تک، یہی روح حسین بن علیؑ کے وجود اقدس میں جلوہ گر تھی۔خود آپؑ ہی کے قول کے مطابق آپؑ کے خون اور زندگی کا جزء بن گئی تھی۔امام حسینؑ کا اس کام سے الگ ہونا ممکن نہیں تھا۔اپنے آخری لمحات میں امام حسینؑ جس وقت قتل گاہ کے نشیب میں پڑے ہوئے ہیں اور ہلنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے ،دشمن سے لڑنے کی بھی طاقت نہیں ،اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے اور مشکل سے ہل پاتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ کے کلام سے غیرت ٹپکتی ہے،امام حسینؑ کے کلام سے عزت آشکار ہے،امام حسینؑ کے کلام سے عظمت نمایاں ہوتی ہے۔فوج یزیدی آپؑ کا سر مبارک جسم سے الگ کرنا چاہتی ہے لیکن ان پر آپؑ کی شجاعت اور ہیبت طاری ہونے سے ایسا کرنے کی جرأت نہیں ہوئی__ بعض لشکری کہتے ہیں ایسا نہ ہو کہ امام حسینؑ نے کوئی جنگی چال چلی ہو کہ جیسے ہی کوئی پاس پہنچے تو اس پر جھپٹ پڑیں،ان کے حملے کے سامنے ٹھہرنے کی کسی کو مجال نہیں ہے۔ایک ناپاک اور بزدلانہ چال چلتے ہیں کہتے ہیں کہ اگر ہم حسینؑ کے خیموں پر حملہ کر دیں تو ان میں بچاؤ کی طاقت نہیں ہوگی___ امام حسینؑ پڑے ہوئے ہیں۔میں آپ کی اس حالت کا نقشہ نہیں کھینچ سکتا، یزیدی لشکر اہل حرم کے خیموں پر حملہ کرتا ہے ایک شخص چلاتا ہے: حسینؑ تم زندہ ہو؟ فوج نے اہل حرم کے خیموں پر حملہ کر دیا ہے۔امامؑ بہت مشکل سے اپنے زانوؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اپنے نیزے کا سہارا لے کر فریادہ کرتے ہیں : "**ویلکم یا شیعة آل ابی سفیان ان لم یکن لکم دین و لا تخافون المعاد فکونوا احراراً فی دنیاکم** "اے ابوسفیان کی اولاد کے ہاتھوں بکے ہوئے لوگو!اے آل ابوسفیان کے پیرو! اگر تم خدا کو نہیں پہچانتے ،اگر تم قیامت پر ایمان اور اعتقاد نہیں رکھتے ،تو بھی تمہاری انسانی آزادی اور شرافت کہاں چلی گئی؟" ایک کہتا ہے:۔"**ماتقول یابن فاطمة؟**" (اے فاطمہ کے بیٹے !کیا کہتے ہو؟)

آپؑ نے جواب دیا:" **انا اقاتلکم و انتم تقاتلونی و النساء لیس علیھن جناح** "(میں تمہارا مدمقابل ہوں، حسینؑ کا یہ جسم حاضر ہے،اس پر تلواروں کی ضربیں لگاؤ لیکن حسینؑ کی روح کو یہ گوارہ نہیں ک وہ زندہ ہو اور کوئی شخص اس کے خیموں کے قریب پہنچ رہا ہو)۔

عوامل میں سے ہر ایک کی ارزش و قیمت:

مقدس تحریک حسینی کی ساخت میں تین بنیادی عناصر ہیں اور مجموعی طور پر تین عوامل نے اس

بڑے حادثہ کو صورت بخشی ہے۔ایک سبب یہ ہے کہ معاویہ کی موت کے فوراً بعد یزید بن معاویہ حکم دیتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام سے ضرور بیعت حاصل کی جائے، امام علیہ السلام بیعت سے انکار کرتے ہیں ۔وہ غیر معمولی طور پر مصر ہیں اور اس تقاضے سے باز نہیں آتے اور امام علیہ السلام شدت سے منع کرتے ہیں اور کسی قیمت پر بیعت کیلئے تیار نہیں ہیں چاہے جان چلی جائے، یہیں سے مسئلہ شروع ہوجاتا ہے۔

دوسرا سبب جس کا اس تحریک پر اثر رہا ہے اور جسے دوسرے بلکہ تیسرے درجے کا سبب شمار کرنا چاہیے یہ ہے کہ جب صورتحال ایسی ہوگئی کہ یزید کی طرف سے اصرار اور امام علیہ السلام کی طرف سے انکار ہوتا ہے تو امام علیہ السلام مکہ کی طرف ہجرت کرجاتے ہیں ۔مکہ میں دو ایک مہینے قیام کے بعد اہل کوفہ کو کسی طور حالات کی خبر ملتی ہے، اس وقت اہل کوفہ ہوش میں آتے اور امامؑ کو بلاتے ہیں۔ہم جو کچھ سنتے ہیں اور خاص طور پر جو بعض درسی کتابوں میں لکھا ہوا ہے اس کے برعکس امام علیہ السلام کی تحریک کا سبب ہے۔امام علیہ السلام نے اہل کوفہ کی دعوت پر قیام نہیں کیا بلکہ امام علیہ السلام حرکت میں آتے ہیں۔ بیعت کی مخالفت کرنے اور امام علیہ السلام کے قیام سے مطلع ہونے پر چونکہ کوفہ کا ماحول نسبتاً سازگار تھا وہ لوگ متحد ہوگئے اور انہوں نے امامؑ کو بلوا بھیجا۔

حسینی تحریک میں امر بہ معروف و نہی از منکر کی اہمیت:

تیسرا سبب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔اس سبب کا خود امام علیہ السلام نے صراحت کے ساتھ مکرر بیعت کے مسئلے اور اہل کوفہ کی دعوت کا ذکر کئے بغیر ایک مستقل اور بنیادی سبب کے طور پر ذکر کیا ہے اور اس بات کا حوالہ دیا ہے۔

ان تینوں اسباب کی اہمیت ایک جیسی نہیں ہے۔امام علیہ السلام کی تحریک میں ہر ایک کی معینہ مدت ہے البتہ اہل کوفہ کی دعوت کا مسئلہ، اس سبب سے تحریک امام کو جو اہمیت ملتی ہے وہ بہت سادہ اور معمولی سی ہے (امام حسینؑ کے عمل کی سطح پر نہ کہ ہمارے کاموں کی سطح پر) کیونکہ اس سبب سے ایک ولایت اور ایک علاقہ جو اپنے اندر طاقت رکھتا ہے اپنی آمادگی کا اعلان کردیتا ہے۔قاعدے کے مطابق زیادہ سے زیادہ پچاس فیصدی کامیابی کا امکان رکھتا تھا، اس سے زیادہ کامیابی کا امکان نہیں رکھتا تھا۔

جب اہل کوفہ متفق ہوگئے اور فرض کیجئے کہ انہوں نے اتفاق بھی کرلیا اور اپنے عہد پر قائم بھی رہ

جاتے اور خیانت نہ بھی کرتے تب بھی کوئی یہ گمان نہیں کرسکتا تھا کہ امام علیہ السلام کی کامیابی سو فیصد ہے کیونکہ تمام لوگ کوفہ کے باشندے نہیں تھے۔ اگر ہم شام کے لوگوں کو نظر میں رکھتے ہیں جو بالکل آل سفیان کے وفادار تھے تو کامیابی کے امکان کو پچاس فیصد گھٹا دینا کافی ہوتا (وجہ یہ ہے کہ یہی شامی تھے جو امیر المومنینؑ کی خلافت کے دور میں جنگ صفین میں کوفہ کے باشندوں کے مدمقابل ہوئے اور اٹھارہ مہینے تک کوفیوں سے لڑتے مرتے اور مقابلہ کرتے رہے تھے) بہرحال زیادہ سے زیادہ تیس یا چالیس فیصد کامیابی کا امکان ہے۔ لوگ اپنی آمادگی ظاہر کرتے ہیں اور امام علیہ السلام ان کی دعوت کا مثبت جواب دیتے ہیں۔ اس کی جس مقررہ حد تک اہمیت ہے وہ وہی معمولی حد ہے یعنی بہت سے عام لوگ ان حالات میں مثبت میں ہی جواب دیں گے لیکن بیعت کے مطالبے اور امامؑ کے انکار کا سبب جو انہی ابتدائی دنوں سے ظاہر ہوگیا تھا حسینی تحریک کو اہل کوفہ کی دعوت کی بہ نسبت زیادہ قدر و قیمت عطا کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ابھی ابتدائی ایام ہیں لوگوں نے حمایت اور مدد کا اعلان نہیں کیا ہے، وفاداری کا اعلان نہیں کیا ہے، ایک جابر اور سخت حکومت ہے جس کی سختی پچھلے بیس سال میں معاویہ کے زمانے میں اپنے عروج کو پہنچی ہے (ایسی حکومت بیعت طلب کر رہی ہے)۔ معاویہ نے خاص طور پر اپنی حکومت اور سلطنت کی دوسری دہائی میں اس قدر سختی دکھائی کہ سب کی جان نکال لی۔ ایک کام یہ کیا کہ اس کی پوری سلطنت یہاں تک کہ مدینہ اور مکہ میں بھی لوگ جمعہ کی نمازوں میں حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو کھلم کھلا ایک عبادتی عمل کے طور پر برا بھلا کہتے تھے اور اگر کوئی چوں و چرا بھی کرتا تھا تو اس کے سر کی خیر نہیں ہوتی تھی، اس نے اس قدر دہشت زدہ کر دیا تھا کہ کسی شخص کیلئے آخری دنوں میں تو زبان پر حضرت علیؑ کا نام لانا بھی جرم ہوگیا تھا۔ یہ تاریخ کی عبارت ہے۔ اگر لوگ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کہنا چاہتے تھے تو اشاروں اور سرگوشی میں کہتے تھے۔ حد یہ ہوگئی تھی کہ اگر حضرت علی علیہ السلام سے متعلق کوئی ایسی حدیث ہوتی جس حدیث میں حضرت علی علیہ السلام کی چھوٹی سے چھوٹی خوبی کا ذکر ہوتا بھی تو وہ محدث اور راوی جو ایک دوسرے سے روایت کرتے تھے ان خالی کمروں پر جہاں صندوق رکھتے ہوتے تھے پردے کھینچ دیتے تھے، دروازے بند کر دیتے تھے۔ ایک دوسرے کو قسمیں دلاتے تھے کہ اس بات کو ظاہر نہ کرنا، میری بات ہر جگہ نقل نہ کرنا، اگر روایت کرنا چاہو تو ایسے آدمی سے کہنا جو سو فیصدی راوی ہو۔ تاکہ وہ اس روایت کو پی جائے اور ظاہر نہ کرے۔

ایسے مشکل حالات میں اس شخص کا جانشین خلیفہ ہوا ہے جو اس سے زیادہ جوان، زیادہ مغرور، زیادہ ظالم و بے رحم اور سیاست سے اتنا زیادہ بے خبر کہ سیاسی مراعات بھی نہیں دیتا۔ اس وقت ایسی طاقت کے سامنے "نہ" کہنا کوئی چھوٹی موٹی بات نہیں ہے۔ (تم بیعت کرو، نہیں میں، بیعت نہیں کرتا، میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دو گے تو بھی میں بیعت نہیں کروں گا)۔ ایسے حالات میں دیکھتے ہیں کہ امام علیہ السلام تن تنہا صرف اپنی ذات سے ایک نہایت جابر حکومت کے ناجائز مطالبے کے سامنے ڈٹے کھڑے ہیں اور کوئی ایک مددگار اور حامی بھی نہیں ہے، یہاں تک کہ دس فیصدی کامیابی کا بھی امکان نہیں ہے۔ آپ اس لحاظ سے اپنی رائے اور اپنا عقیدہ بیچنے کو یا محض دکھاوے کو بھی تیار نہیں ہیں کیونکہ بعد میں تاریخ یہ نہیں کہے گی کہ امام حسین علیہ السلام نے جبر و زور کے تحت بیعت کر لی ہے یہی لوگ جو جبر سے بیعت لیتے ہیں پیسے کے زور سے تاریخ بھی لکھوا لیتے ہیں، جیسے کہ انہوں نے لکھوائی ہے۔

معاویہ اور اس کے ساتھ اور رشتہ دار مسلمانوں کے بیعت المال کا کچھ حصہ آج کل کی اصطلاح میں اس زمانے کے مذہبی لوگوں اور عالموں کو ملازم رکھنے پر صرف کرتے تھے۔ آزاد، بے قید، بے ایمان اور بے ضمیر راویوں کو پیسے سے خریدتے تھے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں بدل دیتے تھے، پیغمبرؐ کی حدیثوں میں لوگوں کے نام بدل دیتے تھے، حضرت علی علیہ السلام کے دشمنوں کی تعریف میں حدیثیں گھڑتے تھے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ "ثمرۃ بن جندب" نے آٹھ ہزار مثقال سونا لے کر حضرت علی علیہ السلام کے خلاف ایک حدیث گھڑ ڈالی چنانچہ ان کیلئے تاریخ کا بدل دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اب اس کے بعد جتنی تاریخ بچ رہی وہ حسینی تحریک جیسے عملیات کی بدولت بچی اور اگر امام حسین علیہ السلام بھی خاموش ہو جاتے تو تاریخ بھی بدل دی گئی ہوتی۔ پس یہ پہلو حضرت ابا عبداللہ علیہ السلام کی تحریک کو کوفہ کی دعوت کے مقابلے میں زیادہ اعلیٰ قدر و قیمت عطا کرتا ہے۔

البتہ تیسرا سبب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے اور حضرت ابا عبداللہ علیہ السلام کامل صراحت کے ساتھ اس سبب کا حوالہ دیتے ہیں، اس سلسلے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثوں اور اپنے نصب العین کا حوالہ دیتے ہیں اور بار بار نیکی کے حکم اور برائی کی ممانعت کا ذکر کرتے ہیں اور کوفہ والوں کی بیعت اور دعوت کا نام نہیں لیتے۔

یہ سبب دوسرے دو اسباب کی نسبت حسینی تحریک کو بہت زیادہ منزلت بخشتا ہے۔ اسی سبب کی

بدولت اس تحریک میں وہ شائستگی پیدا ہوئی جو ہمیشہ قائم رہے گی، ہمیشہ یاد رہے گی، سبق دیتی رہے گی باوجود یکہ تمام اسباب سبق آموز ہیں لیکن اس میں سبق آموزی زیادہ ہے کیونکہ اس سبب کا تکیہ نہ اہل کوفہ کی دعوت پر ہے اور نہ بیعت کے مطالبے پر یعنی اگر امامؑ کو بلایا بھی نہ جاتا تب بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے قانون کے تحت امام حسین علیہ السلام تحریک ضرور شروع کرتے۔ ان سے بیعت کا مطالبہ نہ بھی ہوتا پھر بھی وہ خاموش نہ بیٹھتے۔ موضوع بہت دور ہوا جا رہا ہے۔ پہلے سبب کے مطابق چونکہ اہل کوفہ نے دعوت دی ہے اور پچاس فیصدی یا اس سے قدرے کم کامیابی نقشہ بن گیا ہے۔ اس لئے امامؑ سفر کرتے ہیں یعنی اگر صرف یہی سبب حسینی تحریک کی تشکیل میں کارگر ہوتا، اگر اہل کوفہ دعوت نہ دیتے تو امام حسین علیہ السلام اپنی جگہ سے نہ ہلتے۔ دوسرے سبب کے مطابق وہ لوگ امام علیہ السلام سے بیعت مانگتے ہیں اور آپؑ فرماتے ہیں کہ میں تمہاری بیعت نہیں کرونگا یعنی اگر صرف یہی سبب ہوتا اگر حکومت وقت امام حسین علیہ السلام سے بیعت نہ مانگتی تو امام حسین علیہ السلام کو بھی ان سے کوئی سروکار نہ ہوتا اور آپؑ فرماتے کہ نہ تمہیں مجھ سے کوئی غرض ہے اور نہ میں تم سے کوئی سروکار رکھتا ہوں۔ تم مجھ سے بیعت نہیں چاہتے بس بات ختم ہے چنانچہ اس سبب کے مطابق اگر وہ لوگ بیعت کا مطالبہ نہ کرتے تو حضرت ابا عبداللہ علیہ السلام بھی سکون، امن اور چین سے رہتے، اپنی جگہ بیٹھے رہتے، کوئی سانحہ یا ہنگامہ برپا نہ ہوتا۔

البتہ تیسرے سبب کے مطابق امام حسین علیہ السلام تنقید اور اعتراض کرنے والے شخص ہیں۔ ایک انقلابی شخصیت ہیں، ایک قیام کرنے والے مرد ہیں، مثبت سوچ رکھنے والے انسان ہیں۔ اب کوئی اور محرکات ضروری نہیں ہیں، ہر جگہ خرابی پھیلی ہوئی ہے، خدا کا حلال، حرام اور خدا کا حرام، حلال ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کے بیت المال پر نالائق لوگوں کا قبضہ ہے اور اس کا مال ان طریقوں سے خرچ ہو رہا ہے جن کیلئے خدا کی رضا نہیں ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: جو شخص ایسے حالات و اطوار دیکھے "**فلم یغیر علیہ بفعل و لا قول**" پس اگر اسے اپنے قول و فعل سے تبدیل نہ کرے "**کان حق علی اللہ ان ید خلہ مدخلہ**" تو یہ سزاوار ہے (خدا کے قانون سے ثابت ہے) کہ خدا ایسے شخص کو وہاں لے جائے گا جہاں ظالم، جابر، ستمگار اور خدا کا دین بگاڑنے والے جائیں گے اور انہی کے ساتھ اس کا حشر کرے۔ آپ اپنے جد کے قول کا حوالہ دیتے ہیں کہ ایسے حالات میں جو شخص جانتا اور سمجھتا ہے اور اعتراض کرتا اس کا حشر گنہگاروں کی جماعت کے ساتھ ہوگا۔ صرف یہی حدیث نہیں ہے بلکہ اس ضمن

میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری حدیثیں بھی موجود ہیں، ایک حدیث امام رضا علیہ السلام جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے: "**اذا تواکلت الناس الامر بالمعروف و النھی عن المنکر**" جب لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک دوسرے پر ٹالنے لگیں یعنی ہر شخص خاموش رہے اور یہ انتظار کرے کہ دوسرا نیکی کا حکم دے گا اور بدی سے منع کرے گا اور یوں نتیجے میں کوئی بھی کھڑا نہ ہو۔ "**فلیاذنوا بوقاع من اللہ**" تو پھر لوگوں کو عذاب الٰہی کا منتظر اور اس کیلئے تیار رہنا چاہئے۔ کیسا عذاب؟ آسمان سے پتھر برسیں گے؟ نہیں! قرآن شریف کی آیتوں میں عذاب الٰہی کی یوں تفسیر کی گئی ہے:

"قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَى أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ"

کہہ دیں اے رسولؐ! خدا قادر ہے، تم خدا کے عذاب سے ڈرو۔ خدا اس پر قادر ہے کہ تمہارے سروں پر عذاب نازل کرے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے عذاب کو جوش میں لائے یا تمہیں گروہوں میں بانٹ دے یا خود تمہارا نقصان تم تک پہنچا دے یعنی تمہیں ایک دوسرے لڑا کر مار دے۔ (انعام۔ ۶۵)

اہل بیت علیہم السلام اپنی روایتوں میں یہ معانی بیان فرماتے ہیں: سر پر عذاب کا مطلب یہ ہے کہ ہم تم پر اوپر سے عذاب نازل کریں گے، تم اپنے پاؤں تلے سے یعنی زیر زمیں سے عذاب دیکھو گے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا جس وقت لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیں تو وہ منتظر ہیں کہ ان کے پیچھے سے عذاب الٰہی آنے والا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث بھی ہے جسے علماء شیعہ نے اپنی معتبر کتابوں جیسے اُصول کافی میں درج کیا ہے اور سنی علماء نے بھی اس کی روایت کی ہے۔ غزالی نے یہ حدیث احیاء العلوم میں نقل کی ہے اور اس کی سند اہل تسنن کی کتب احادیث میں ملتی ہے: "**لتامرُن بالمعروف و لتنھُن عن المنکر او یسلّطن اللہ علیکم شرارکم فیدعوا خیارکم فلا یستجاب لھم**"۔ "(یعنی نیکی کا حکم دیتے رہو اور بدی سے منع کرتے رہو ورنہ خدا تم پر بدوں کو مسلط کر دے گا، پھر تمہارے نیک لوگ بھی بلاتے رہیں گے تو انہیں جواب نہیں دیا جائے گا)۔ لوگ زیادہ تر یوں مطلب بیان کرتے ہیں کہ جب برے تم پر مسلط ہو گئے تو تم میں سے

نیک لوگ خدا کی درگاہ میں فریاد کریں گے لیکن خدا ان کی دعا کو قبول نہیں کرے گا" یعنی جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیتے ہیں ان کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ خدا انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے۔ وہ چاہے خدا سے جتنی فریاد کریں، اس گناہ کی وجہ سے ان کی دعا قبول نہیں ہوتی لیکن غزالی نے اس آیت کے ایک باریک معنی بیان کئے ہیں حالانکہ وہ ایک درویش صفت انسان ہے اور اجتماعی مسائل میں نہیں پڑتا، پھر بھی یوں کہتا ہے اس جملے "**فیدعوا خیارکم فلا یستجاب لھم**" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ خدا سے فریاد کرتے ہیں اور خدا ان کی دعا قبول نہیں کرتا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں: جب لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیں گے تو اتنے حقیر اور پست ہوجائیں گے کہ ان کا رعب، دبدبہ، عزت، کرامت ختم ہوجائے گی چنانچہ جس وقت وہ ظالموں کی درگاہ میں جائیں گے تو چاہے جتنی ندا کریں گے ان کی کوئی نہیں سنے گا یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری عزت قائم رہے اور دوسرے تمہارے سامنے حساب دہ ہوں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک نہ کرو البتہ جس وقت تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عامل نہیں رہو گے تو پہلی خاصیت تو یہ تمہاری کمزوری ہوگی، تم پست اور ذلیل ہوجاؤ گے اور پھر دشمن بھی تمہیں کچھ نہیں سمجھے گا۔

بر در ارباب بی مروت دنیا چند نشینی که خواجه کی بدر آید

(دنیا کے بے مروت اربابوں کے دروازے پر)

(تو کب تک اس انتظار میں بیٹھا رہے گا کہ خواجہ کب باہر آتا ہے)

اس وقت تم ایک غلام کی طرح چاہے جتنی خوشامد کرتے رہو کوئی تمہیں جواب بھی نہیں دے گا۔ یہ معنی بہت لطیف ہے۔ ہمارے اسلام کا یہ قطعی اُصول ہے اور امام حسین علیہ السلام کی پاک ہستی نے اس اُصول کا حوالہ دیا ہے چنانچہ وہ یوں سمجھاتے ہیں: فرض کیجئے کہ اہل کوفہ مجھے دعوت نہ دیتے، فرض کیجئے کہ یزیدی حکومت مجھ سے بیعت نہ مانگتی پھر بھی میں امر بالمعروف ارنہی عن المنکر کے اُصول کے مطابق خاموش نہیں بیٹھتا۔ ضروری ہے کہ ہم خود اس اصل کے بارے میں مزید گفتگو کریں، ہمیں بنیادی طور پر اس بات کی ضرورت ہے کہ اس اصل کے بارے میں مزید گفتگو کریں، ہمیں بنیادی طور پر اس بات کی ضرورت ہے کہ اس اصل کو پہچانیں، یہ وہ اصل ہے کہ اگر ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث اور آئمہ اطہار علیہم السلام کے فرمودات کی طرف توجہ نہ دیں اور اس فقہ اسلامی کی طرف بھی

رُخ نہ کریں جس کی ہر کتاب میں اور اس کے مختلف ابواب میں ابتدائے اسلام سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک باب چلا آتا ہے اور صرف قرآن ہی کو نظر میں رکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اس مقدس آسمانی کتاب میں یہ موضوع کتنا تکرار ہوا ہے اور جن گذشتہ قوموں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل نہیں کیا ہے ان کی حد درجہ بدبختی کا حوالہ دیتا ہے: "**فلو لا کان من القرون من قبلکم اولوا بقیة ینهون عن الفساد فی الارض**" (ہود۔۱۱۶)۔قدیم نسلوں میں کچھ لوگ صاحب (سرمایہ عقلی، فکری، روحی) کیوں نہیں ہوئے جو فسادوں کے خلاف لڑتے جس سے یہ قومیں ان فسادوں سے تباہ نہ ہوتیں، نابود اور ہلاک نہ ہوتیں؟ دوسری قوم کے بارے میں فرمایا گیا ہے: "**کانو لا یتناهون عن المنکر فعلوه لبئس ما کانوا یفعلون**" (مائدہ۔۷۹)۔ یہ لوگ مجبور اور مصیبت زدہ ہو گئے ہیں، ہلاک ہو گئے، مٹ گئے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ برائیوں سے منع نہیں کرتے تھے، بگاڑ کے خلاف جدوجہد نہیں کرتے تھے اور بہت سی برائیاں کرتے تھے۔مسلمانوں سے خطاب فرمایا گیا ہے: "**و لتکن منکم اُمة یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینهون عن المنکر و اولئک هم المفلحون**" تمہارے درمیان ایک ایسی امت، ایک ایسی جماعت ہونا چاہئے جس کا کام نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا ہو۔(آل عمران۔۱۰۴)

اگر لفظ "من" کو تبعیضی کہیں اور دوسری تفسیر کریں تو اس کے معنی یہ نکلتے ہیں: تمہاری اُمت ایسی اُمت بنائی جائے یعنی تم سب کو ایک ایسی امت بن جانا چاہیے (تم نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو) یہ دونوں تفسیریں درست ہیں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ نیکی کا حکم اور بدی کی روک ٹوک تمام لوگوں کیلئے ایک عام فریضہ ہے اور ایک مقررہ طبقے کیلئے خصوصی فریضہ ہے جو اس بارے میں ایسی خصوصی ذمہ داری رکھتا ہے جو عام الناس کی حد سے باہر ہے۔

تمہارے درمیان ایک ایسی جماعت ہو یا تم ایسی امت بن جاؤ جس کا کام نیکی کی طرف بلانا (امر بالمعروف) اور برائی سے روکنا (نہی عن المنکر) ہو "**اولئک هم المفلحون**" صرف ایسی ہی امت جس میں نیکی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا ہو، نجات یافتہ، باعزت، بابرکت اور ثابت قدم ہو سکتی ہے اور بھلائی اور نجات پا سکتی ہے۔سورہ آل عمران میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق بہت سی آیتیں ملتی ہیں۔ میں نے جو آیت پڑھی وہ اس آیت کے بعد آتی ہے: "**واعتصموا بحبل الله**

جمیعاً و لا تفرقوا" (آل عمران۔۱۰۳)، یہ آیت لوگوں کو اتحاد کی دعوت دیتی اور تفرقے سے روکتی ہے: اے مسلمانو! اپنے درمیان تفرقے اور اختلاف کا وجود نہ ہونے دو، جو اختلاف پیدا ہو گئے ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کرو، اختلافات کو کم کرو، یہ شگاف نہ بڑھنے دو، ان تفرقوں سے جو روز بروز شگاف بڑھتے جا رہے ہیں کسے فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ کیا اسلام کے دشمن کے سوا بھی کسی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ دشمن ہم سے کیا چاہتا ہے؟ کیا وہ اس کے سوا بھی کچھ اور چاہتا ہے کہ ہم مذہب اور فرقے کے مختلف ناموں پر سدا ایک دوسرے سے دست و گریباں رہیں، ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے رہیں؟ قرآن کہتا ہے تفرقے سے بچو! پھر فرماتا ہے "**ولتکن منکم اُمة یدعون الی الخیر**" گویا یہاں "**الخیر**" سے مراد وہی اتحاد ہے یعنی تمہارے درمیان ایک جماعت ہونا چاہیے جو مسلمانوں کو برابر اتحاد اور اتفاق کی تلقین کرتی رہے۔ مسلمانوں میں جو تفرقے اور جھگڑے ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کرتی رہے۔ پھر فرماتا ہے: "**ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا**" (آل عمران۔۱۰۵)، ان جماعتوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو متفرق اور مختلف ہو گئیں، فرقہ فرقہ اور گروہ گروہ ہو گئیں، ٹکڑیوں اور ٹولیوں میں بٹ گئیں۔ آیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ اتحاد کی تلقین کرنے والی ایک الگ الگ ہونے سے روکنے والی دو آیتوں کے درمیان یہ آیت آتی ہے: "**ولتکن منکم اُمة یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولئک ھم المفلحون**"

یہ بالکل درست نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کیلئے افہام و تفہیم، وحدت اور اتفاق کو ایک ایسی نیکی سمجھتا ہے جو تمام نیکیوں کی ماں اور سرچشمہ ہے اور اختلاف اور فرقہ کو چاہے وہ کسی نام اور عنوان سے ہو سب سے بڑی برائی، غلاظت اور ناپاکی بتاتا ہے، دوسری آیت فرماتی ہے: "**کنتم خیر اُمة اُخرجت للناس**" (اے مسلمانو! تم وہ بہترین اُمت ہو جسے بشریت کی بھلائی کیلئے ظہور کیا ہے)۔ یعنی انسانیت کی بھلائی کیلئے تم سے بہتر اُمت آج تک پیدا نہیں ہوئی ہے۔ کیوں؟ کس صفت کے لحاظ سے؟

"**تامرون**

بالمعروف و تنھون عن المنکر" اس وجہ سے کہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔ اس لئے منطقیوں کے قول کے مطابق ہم اس کی ضد کو یوں سمجھیں: ہم مسلمان قوم انسانیت کیلئے بہترین اُمت نہیں ہیں کیونکہ ہم نیکی کا حکم نہیں دیتے اور بدی سے نہیں روکتے۔ اس کے نتیجے میں ہم عزت اور عظمت کا

دعویٰ بھی نہیں کر سکتے، کوئی فخر نہیں کر سکتے، ہمارا اسلام حقیقی اسلام نہیں ہے۔

اگر ہم اس بات کی اہمیت اور عظمت کے موضوع پر قرآن، سنت، حدیث اور ان باتوں کی رو سے جو اس ضمن میں کہی گئی ہیں گفتگو کرنا چاہیں تو بہت سی روایتیں ملتی ہیں جو بتاتی ہیں کہ اسلام نے اس موضوع کو کس قدر اہمیت دی ہے۔

البتہ اس کیلئے ایک تاریخی گفتگو کی ضرورت ہے جس سے یہ واضح ہو سکے کہ اس عظمت و اہمیت کا یہ موضوع وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کس وجہ سے اسلامی دنیا میں روز بروز کمزور اور چھوٹا ہوتا چلا گیا۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ علمی نقطہ نظر سے یعنی کتابوں میں سنیوں سے ہم شیعوں نے زیادہ اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ اگر ہم "کتاب الصلواۃ" سے لے کر "کتاب الدیات" تک شیعی فقہ کی کتابیں سنی فقہ کی کتابوں کے مقابلے میں رکھ دیں تو ہم دیکھیں گے کہ تمام ابواب میں شیعی فقہ مجموعی طور پر زیادہ قطعی، زیادہ شرح، زیادہ مفصل، زیادہ سنجیدہ اور زیادہ مدلل ہے اور میں اس بات کو ثابت بھی کر سکتا ہوں لیکن بد قسمتی سے ہماری فقہی کتابوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا باب تمام ابواب میں بہت چھوٹا ہو گیا ہے لیکن سنیوں میں عملاً چھوٹا ہو گیا ہے۔

معتزلہ جو سنی متکلمین کا ایک فرقہ ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اُصول دین سمجھتا ہے فروع دین نہیں۔ شیعہ کہتے ہیں کہ اُصول دین پانچ ہیں اور فروع دین دس ہیں اور ان دس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو شمار کرتے ہیں۔ معتزلہ دین کے پانچ اُصولوں کے قائل ہیں جن میں سے ایک امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی ہے لیکن خود انہوں نے اپنی کتابوں میں رفتہ رفتہ اس بحث سے بچتے بچتے اسے بالکل چھوڑا کر دیا۔ تمام مؤرخین کہتے ہیں کہ اس کا سبب وہ ٹکراؤ تھا جو اس موضوع پر گفتگو نے اپنے وقت کی سیاست سے پیدا کر لیا تھا چونکہ یہ گفتگو خلفائے وقت کو عریاں کرتی تھی اور وہ اسے روکتے تھے اس لئے معتزلہ مجبور ہو گئے کہ اسے اپنی کتابوں میں بیان نہ کریں یا کم بیان کریں اگرچہ یہ ان کے مذہبی اُصولوں میں سے ایک اُصول شمار ہوتا تھا۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم شیعوں میں بھی یہ موضوع بہت مختصر رہ گیا ہے۔ جب امر بالمعروف و نہی عن المنکر نماز، روزے کی طرح ہیں تو اسے دفن نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کوئی غلامی کا مسئلہ نہیں ہے جو ہم کہیں کہ آج دنیا میں غلامی نہیں ہے جو ہم اس پر بحث کریں اور یہ معقول بات ہے۔ جس وقت وہ مسئلہ

موجود تھا اس وقت اسلام میں غلاموں کے فائدے کیلئے احکام موجود تھے اور ان پر بحث درست تھی۔ جب غلامی ہی نہیں رہی تو اب اس کے بارے میں گفتگو غلط اور بے فائدہ ہے لیکن امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایسا موضوع نہیں ہے جو کبھی ختم ہوسکتا ہو۔ یہ ہمیشہ موجود رہا ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا اس لئے اسے سب مسئلوں سے اوپر رہنا چاہیے۔ یہ کس لئے حذف کیا جائے؟ یہ ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے تا کہ ہم اسے بھول نہ سکیں۔

یورپ کے کچھ مستشرقین، اسلام کے خلاف دعویٰ کرتے ہیں یا یہ کہوں کہ اسلام پر الزام لگاتے ہیں اور اپنی بہت سی کتابوں میں اسے بار بار دہراتے ہیں۔ یہ اسلام کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ قضا وقدر کا دین ہے، یہ ایک ایسا دین ہے جو انسان کے کسی فعال کردار اور ذمہ داری کا قائل نہیں ہے، یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسانی فرائض کو خدا کے سپرد کردے، تم یوں ہی انتظار کرتے رہو، دیکھو خدا کیا کہتا ہے۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام انسان کی آزادی اور اختیار کا قائل نہیں ہے، جو کچھ ہے خدا اور اس کا ارادہ ہے، بنیادی طور پر انسان اس سلسلے میں کسی کام کا فاعل نہیں ہے، اسی لئے اس پر کوئی ذمہ داری یا فریضہ بھی عائد نہیں ہوتا، یہ بالکل جھوٹ ہے، اتفاق سے قرآن مجید یہودیوں پر یہی جرم عائد کرتا ہے، جس وقت موسیٰؑ نے ان سے کہا "یَاقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِی کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ " (مائدہ۔۲۱)، تو انہوں نے موسیٰؑ کو جواب دیا: "فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلاَإِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ " (مائدہ۔۲۴)، اے موسیٰؑ! ہم تو اپنی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں تم اور تمہارے خدا دونوں جاؤ، جنگ کرو اور دشمن کو ہماری سرزمین سے نکال دو، بعد میں ہم بھی پہنچ جائیں گے۔ بدر کی لڑائی میں جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے اصحاب سے مشورہ کررہے تھے تو آپ نے فرمایا تھا: تمہاری کیا رائے ہے؟ اب قافلہ بھاگ گیا ہے، آیا ہم دشمن کا پیچھا کریں یا مدینہ کو پلٹ جائیں؟ ہر شخص نے اپنا اپنا خیال ظاہر کیا۔ حضرت ابوذر غفاری یا جناب مقداد کندی میں سے کسی ایک بزرگ نے کہا یا رسول اللہؐ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہیں گے: "فاذهب انت و ربک فقاتلاً انا هاهنا قاعدون" تم اور تمہارا خدا چلے جاؤ کام انجام دو، ذمہ داری کا تعین کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ آپؐ جو حکم دیں گے وہی ہوگا، اگر آپ حکم دیں کہ دریا میں کود جاؤ تو ہم کود جائیں گے، اگر آپ فرمائیں گے کہ آگ میں کود جاؤ تو ہم کود پڑیں گے۔ اس کے علاوہ یہ قرآن ہی ہے جو انسانی آزادی اور انسان کی شخصی ذمہ داری اور فریضے کے موضوع پر پکار

پکار کر کہہ رہا ہے: "إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا"، (دھر۔ ۳) "وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ" (بلد۔ ۱۰)، "وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا" (اسراء۔ ۱۹)۔ قرآن کی ایسی بہت سی آیتیں ہیں جن میں "فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ" (یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کا کیا ہوا ہے) (شوریٰ۔ ۳۰)، آیا ہے۔ ہم خدا کو جن برائیوں اور برائیوں سے نسبت دیتے ہیں ،خدا کا ان سے پاک اور بری ہونا قرآن بار بار بیان کرتا ہے: "وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ" (نحل۔ ۱۱۸)، اگر لوگ مصیبت زدہ اور مجبور ہو گئے تو ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ خود انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

ان افترا پردازیوں اور جھوٹی باتوں کے بالکل برعکس ایک اور بات یہ ہے کہ اسلام میں ایک ایسا مسئلہ موجود ہے جو دوسری قوموں (آج کی دنیا اور قوموں) میں دینی قانون کی حیثیت سے نہیں ملتا ۔(البتہ یہ میں نہیں کہتا کہ قدیم پیغمبروں کے یہاں نہیں تھا) اور وہ یہ ہے: اسلام تنہا ایک فرد کو اپنے لئے اور خدا کے سامنے ذمہ دار، جواب دہ اور مکلف نہیں جانتا ہے بلکہ فرد کو جماعت کے لحاظ سے بھی ذمہ دار اور جواب دہ سمجھتا ہے۔ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" یہی ہے کہ انسان! تنہا بطور ایک شخص یا ایک فرد اپنے پروردگار کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہے بلکہ سماج کے سامنے بھی ذمہ دار ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا دن قضا وقدر کا دین ہے؟ البتہ قضا وقدر اس مفہوم میں جس میں وہ کہتے ہیں یعنی خدا کا کام پورا کرتا رہے اور انسان اس واقع اور دائرے سے باہر ہو، انسان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، ایسی قضا وقدر جو انسان کی خود مختاری اور ذمہ داری چھین لیتی ہے، قرآن ایسی قضا وقدر کو تسلیم نہیں کرتا۔ کیا آپ اس سلسلے میں اس چھوٹی سی آیت سے بہتر کوئی جملہ پیش کر سکتے ہیں۔ قرآن میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ دو مقامات پر آیا ہے؟: "إِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ" (خداوند اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔) (رعد۔ ۱۱)

یہ آیت ان لوگوں کو جو اس انتظار میں رہتے ہیں کہ خدا ہمیشہ کسی معمولی طریقے پر کاموں کو درست کر دے گا، صاف صاف بتاتی ہے کہ بے فائدہ انتظار نہ کرو۔ "ان" یعنی تحقیق کی رو سے بات یہ ہے، حقیقت اور واقعی یہ ہے کہ وہ لوگوں کے حالات اور اطوار اس وقت تک نہیں سدھارتا "حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ" جب تک کہ وہ لوگ خود ان باتوں کو تبدیل نہیں کرتے جو ان سے متعلق ہیں، جو ان کے

اندر ہیں: اخلاق، ذہنیت، صلاحیتیں، غرض نیت اور آخر میں خود ان کی ذات، کیا آپ اس سے بھی واضح اور صاف ذمہ داری دکھا سکتے ہیں؟ کسی جماعت کی پیش نظر ذمہ داری۔ ایک اور آیت میں ایک قدیم بگڑی ہوئی امت کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ذٰلِکَ بِأَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِعْمَۃً أَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَا بِأَنْفُسِھِمْ"۔ ایسا اس لیے ہوا کہ اللہ جو نعمت کسی قوم کو عنایت فرماتا ہے اس وقت تک اسے نہیں بدلتا جب تک وہ خود اسے نہیں بدلتے اور یہ کہ اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔ (انفال۔ ۵۳)

ایک لحاظ سے اس آیت میں تاکید نسبتاً زیادہ ہے۔ یہ کہنے کے بعد کہ وہ لوگ یوں بگڑ گئے اور چونکہ انہوں نے اپنی حالت خراب کر لی ہم نے بھی اس کی اچھی حالت کو بری حالت میں تبدیل کر دیا فرماتا ہے: " ذلک بان

"یہ

اس وجہ سے ہے کہ خدا ایسا نہیں ہے یعنی جب ہم کہتے ہیں: "کان اللہ" یا کہتے ہیں: "ما کان اللہ" تو بات ایک سنت کی ہو رہی ہے کہ خدا ایسا نہیں ہے یعنی خدا کی خدائی کا تقاضا ہے کہ وہ ایسا نہ ہو (جس وقت انسان کہتا ہے کہ میں ایسا نہیں ہوں، میں ایسا نہیں رہا ہوں تو وہ اپنی شخصیت پر بھروسہ کر کے یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں ایسا شخص ہوں کہ میری شخصیت کا لازمہ یہ ہے کہ میں گذرے زمانے میں ایسا تھا، آج بھی ایسا ہی ہوں): "ذٰلِکَ بِأَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِعْمَۃً أَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَا بِأَنْفُسِھِمْ": خدا ایسا نہیں تھا یعنی خدا کی خدائی کا تقاضا ایسا ہے۔ قرآن میں ایک اور آیت ہے جسے "لم یک مغیرا" کی مناسبت سے عرض کروں گا "وَمَا کُنَّا مُعَذِّبِینَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُولًا" (اسراء۔ ۱۵)، ہم کسی قوم پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتے جب تک کہ اس کے سامنے اتمام حجت نہ ہو جائے۔ ہم کسی قوم پر اس وقت عذاب نازل کرتے ہیں جب وہ لوگ بات کو سمجھ لیتے ہیں لیکن اپنی سمجھ اور عقل کے باوجود دوسری طرح عمل کرتے ہیں، فرماتا ہے "ما کنا معذبین" ہم ایسے نہیں تھے یعنی ہمارا خدائی کا تقاضا ایسا ہے کہ ہم اس طرح نہیں ہو سکتے، ہمارا خدائی کا تقاضا ہے کہ ہم اس طرح کے ہوں: "ذٰلِکَ بِأَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِعْمَۃً أَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَا بِأَنْفُسِھِمْ" خدا ایسا نہیں ہے، کیا ہم اس سے بہتر ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اس سے زیادہ اطمینان دلا سکتے ہیں وہ "انتظارات"

جس شکل میں ہم انتظار کر رہے ہیں وہ بیہودہ ہیں؟ یہاں نص قرآن ہے، ہم قرآن کی نص سے ٹکرا نہیں سکتے۔

علامہ اقبالؒ نے اسی آیت سے ایک نکتہ بیان کیا ہے جو بہت ہی اعلیٰ ہے۔ "حتی یغیروا" کی ضمیر سے استفادہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں قرآن فرماتا ہے: "حَتَّی یُغَیِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ" اور یوں نہیں فرماتا ہے "حَتَّی یُغَیِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ"۔ اگر ایسا کہتا تو اس کے معنی یہ ہوتے: خدا آدمیوں کے احوال کو چاہے وہ اچھے ہوں یا برے اس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ خود ان سے متعلق یعنی روح، اخلاق اور ان خصوصیات سے متعلق جو ان کے اختیار و عمل میں ہیں احوال اور اوضاع بدل نہیں جاتے۔ نہیں ایسا نہیں فرماتا بلکہ "یُغَیِّرُوا" فرماتا ہے یعنی جب تک وہ خود اپنی ایجاد، اختیار اور سوچ کے ثبات میں پیشرفت نہیں کرتے ان کی وضع اور حالت نہیں بدلتی یعنی اگر کوئی اور قوم آکر لوگوں کے اطوار و احوال زور زبردستی سے بدلنا چاہے جب تک کہ وہ لوگ خود ارادہ نہیں کر لیتے جب تک کہ وہ لوگ خود سوچ بچار میں ثبات پیدا نہیں کرتے ان کی وضع نہیں بدل سکتی۔ اے لوگو! انتظار نہ کرو کہ باہر سے دوسرے آئیں اور تمہاری وضع درست کریں، جو قوم یہ چاہے کہ باہر کے مشیر اس کیلئے کوئی ارادہ کریں تو کبھی بھی وہ آدمی نہیں بن سکے گا چونکہ وہ "یغیروا" نہیں ہے اسے "یغیروا" ہونا ہی چاہیے۔ اس کے پاس ایجاد، خیال اور اسکیم ہونی چاہیے، اسے خود اپنے لئے فیصلہ اور انتخاب کرنا چاہیے، جس وقت کوئی قوم ایسے مقام پر پہنچ گئی جہاں اس نے اپنے لئے کوئی فیصلہ کیا، خود ہی اپنا راستہ منتخب کیا، خود ہی اپنے کام میں طباعی دکھائی وہ قوم خدا کی رحمت اور تائید کی آس لگا سکتی ہے اور ان چیزوں کا انتظار کر سکتی ہے جن کے قرآن نام گناتا ہے، خدا کے فیوض، خدا کی امداد اور خدا کی تائید کی توقع کر سکتی ہے۔ اگر بیکار انتظار کرنا درست ہوتا اور انسان اپنی انسانی شخصیت پر ہی بھروسہ کرتا تو امام حسین علیہ السلام ہر شخص سے زیادہ اس بات کے لائق تھے کہ اس وقت تک انتظار کرتے رہتے جب تک خدا اپنی رحمت ان پر اور ان کی امت پر نازل نہ کرتا۔ پھر انہوں نے انتظار کیوں نہیں کیا؟ امام حسین علیہ السلام چاہتے تھے "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسهم" ہو۔ آپؑ چاہتے تھے کہ اپنی طباعی سے کام لیں۔ سماجی حالات میں تبدیلی لائیں اسی تعبیر سے جسے خود آپؑ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے سنا تھا: "فلم یغیر علیه بفعل و لا قولٍ کان حقا علی اللہ ان یدخله مدخله" کیسے تبدیل کریں؟ کیا ارادہ کریں؟۔

سیدھے سادے کاموں سے ہم بھی واقف ہیں، انجام دے سکتے ہیں، سادہ مسائل کی سطح پر کام تو سبھی خوب کر لیتے ہیں مثلاً اسلام نے کہا کہ حاجی کی زیارت کو جاؤ (خوب ہم جاتے ہیں، چائے پیتے ہیں، مٹھائی کھاتے ہیں، کھڑے ہوتے ہیں، آ جاتے ہیں) یا تشییع جنازہ میں شریک ہو جاؤ، فاتحہ کی مجالس میں شرکت کرو، یہ اسلام کے آسان کام ہیں، ہر شخص یہ آسان کام کر سکتا ہے۔ اسلام ہمیشہ ایسے کاموں سے نہیں چلتا، ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ اس وقت امام حسین علیہ السلام کی طرح کھڑا ہونا اور حرکت کرنا چاہیے، امام حسین علیہ السلام کی طرح قیام کرنا چاہیے جو نہ صرف اس دن کے اسلامی معاشرے کو جھنجھوڑ ڈالے بلکہ اس کی لہر پانچ سال کے بعد ایک رنگ میں اپنا اثر دکھائے، دس سال بعد دوسرے رنگ میں اثر ڈالے بلکہ اس کی لہر پانچ سال کے بعد ایک رنگ میں اپنا اثر دکھائے، دس سال بعد دوسرے رنگ میں اثر ڈالے، تیس سال بعد ایک اور شکل میں ساٹھ سال کے بعد کسی اور شکل میں سو سال، پانچ سو سال کے بعد اور شکلوں میں اور ہزار سال کے بعد بھی تحریکوں میں روح پھونکے، اس کو کہتے ہیں: "یُغَیِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ"

ہم اپنے بچوں کو پیار کرتے ہیں، کیا امام حسین علیہ السلام اپنے بچوں سے محبت نہیں کرتے تھے؟ یقیناً وہ زیادہ محبت کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ ایسے نہیں تھے کہ ہم سے کم اپنے اسماعیلؑ سے پیار کرتے تھے، بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ ہم سے بہتر انسان تھے اور یہ جذبات انسانی جذبات ہیں، وہ ہم سے بہتر انسان تھے اور ناگزیر طور پر ان کے انسانی جذبات بھی زیادہ بہتر تھے۔ امام حسین علیہ السلام بھی ہم سے زیادہ اپنے بچوں کو پیار کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ خدا کو سب انسانوں اور سب چیزوں سے زیادہ دوست رکھتے تھے۔ وہ خدا کے سامنے اور خدا کی راہ میں کسی کو گنتی میں نہیں لاتے تھے۔

لکھا ہے کہ جن دنوں ابا عبداللہؑ کربلا کی طرف بڑھ رہے تھے ان کا پورا خاندان ان کے ساتھ تھا۔ دراصل ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جب انسان سفر پر جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ ہوں تو اس کے سامنے ایک فطری ذمہ داری جاگ اُٹھتی ہے اور ان کیلئے وہ برابر فکرمند رہتا ہے کہ کیا ہوگا؟

لکھا ہے کہ اس طرح سفر کر رہے تھے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کو نیند آ گئی اور اسی سواری

کی حالت میں غنودگی طاری ہوگئی۔ ذراسی دیر کے بعد آپؑ نے سر اُٹھا کر فرمایا " انا للہ و انا الیہ راجعون" جس وقت آپؑ نے یہ جملہ کہا اور کلمہ استرجاع پر جاری کیا سب لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ امامؑ نے یہ جملہ کس لئے ادا کیا، کیا کوئی نئی خبر ہے، امامؑ کے ایک عزیز بیٹھے تھے، وہی جنہیں امام حسین علیہ السلام بہت چاہتے تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ان صفات کے علاوہ ایک خاص صفت جس کے باعث یہ اپنے والد بزرگوار کو بہت زیادہ عزیز تھے، آپ کی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کامل مشابہت تھی (جب ایسا فرزند خطرے میں گھرا ہو تو باپ کو جتنا دکھ ہو کم ہے) یعنی جناب علی اکبرؑ سامنے آکر عرض کرتے ہیں: "یا ابتاہ! لم استرجعت" آپ نے "انا للہ و ان الیہ راجعون۔" کیوں کہا؟ آپؑ نے فرمایا: میں نے نیند میں فرشتے کی آواز سنی جو کہتا تھا "القوم یسیرون و الموت تسیر بھم" یہ قافلہ سفر کر رہا ہے لیکن موت ہے جو اس قافلے کو بڑھائے لئے جا رہی ہے یعنی اس طرح میں فرشتے کی آواز سے سمجھ گیا کہ ہمارا انجام موت ہے، ہم اپنی موت کے یقینی انجام کی طرف جا رہے ہیں، بالکل وہی بات جو حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ سے کہتے ہیں۔

انہوں نے کہا بابا جان!"او لسنا علی الحق" کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ کیوں میرے پیارے بیٹے؟ جب یہ بات ہے، ہم کو مقدر جس طرف لے جا رہا ہے، لے جائیں، بابا! مقدر میں موت ہے یا حیات، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہم حق کے راستے پر چل رہے ہیں یا نہیں؟ امام حسین علیہ السلام وجد میں آئے، خوش ہوگئے اور چہرہ بشاش ہوگیا، آپؑ کی اس دعا سے انسان سمجھ سکتا ہے۔ آپؑ نے فرمایا: میں اس وقت اس قابل نہیں ہوں کہ تجھ جیسے شائستہ فرزند کے شایان شان جزا دے سکوں، خدا سے دعا مانگتا ہوں: اے خدا تو میری جگہ اس فرزند کو وہ جزا عطا فرما جو اس کے لائق ہو۔"جزاک اللہ عنی خیر الجزاء" باپ کس قدر چاہتا ہے کہ ایسے فرزند کو مناسب موقع پر جزا دے؟

اب ذرا تصور کیجئے کہ عاشور کے دن ظہر کا وقت گزر چکا ہے۔ یہی بیٹا اسی باپ کے سامنے میدان جنگ میں جا کر دلیری اور جرأت دکھا چکا ہے، زورمندوں کو پچھاڑ چکا ہے، وار کر چکا ہے، وار کھا چکا ہے۔ حال یہ ہے کہ ان کا منہ خشک اور زبان خشک ہو کر لکڑی کی طرح سوکھ گئی ہے۔ میدان سے پلٹے ہیں، ان حالات میں (میں نہیں جانتا اس روز باپ نے جو جملہ اس سے کہا تھا وہی شاید اسے یاد ہو)

آتے ہیں اور باپ سے درخواست کرتے ہیں "**یا ابتاہ! العطش قد قتلنی و ثقل الحدید اجھدنی فھل الی شربۃ من الماء سبیل**" باباجان! پیاس مجھے مارے ڈال رہی ہے، ہتھیاروں کا وزن مجھے تکلیف دے رہا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ میرے حلق میں پانی کا ایک گھونٹ پہنچ جائے، جس سے مجھ میں قوت آجائے اور میں واپس جا کر جہاد کروں؟ اس فرزند رشید کو امام حسین علیہ السلام جواب دیتے ہیں وہ یہ ہے: پیارے بیٹے! مجھے اُمید ہے کہ تم بہت جلد شہادت پر فائز ہو گئے اور اپنے جدؐ کے ہاتھوں سیراب ہو گئے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی شرائط

اس سے پہلے جو باتیں عرض کی گئیں ان سے معلوم ہوا کہ تحریک حسینی میں کل تین عوامل کارفرما ہیں: ایک بیعت سے انکار، دوسرے اہل کوفہ کی دعوت قبول کرنا اور تیسرے جو دونوں سے زیادہ مستحکم ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان تینوں میں سے ہر ایک نے اپنے طور پر امامؑ کیلئے ایک ذمہ داری معین کر دی کہ جس کے عوض خاص ردعمل دکھایا جائے۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اس تحریک کی قدر و منزلت ان تینوں عوامل کے مطابق مختلف اور جدا جدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہم صرف اہل کوفہ کی دعوت کی عامل کو نظر میں رکھیں تو اس تحریک کی ایک مقررہ حد تک اہمیت ہو گی۔ اگر بیعت سے انکار کے عامل کو نظر میں رکھیں تو اس کی اہمیت اور قدر و منزلت بہت زیادہ عظیم ہو گی۔ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عامل کو نظر میں رکھیں تو اس کی اہمیت سو فیصد بڑھ جائے گی۔ وجہ یہ ہے کہ دعوت کے عامل سے کامیابی کا امکان تقریباً پچاس فیصدی یا اس سے بھی کمتر ہے لیکن بیعت سے انکار کے عامل سے اتنا بھی امکان نہیں ہے بلکہ وہ تو سو فیصدی خطرناک مقابلہ ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور بیعت کے عامل میں بھی اتنا ہی عظیم فرق ملتا ہے۔ بیعت کے عامل میں مطالبہ دشمن کی طرف سے ہے یعنی ایک غیر شرعی اور ناجائز مطالبہ ہے اس لئے امامؑ اس مطالبہ کے جواب میں "نہ" کہتے ہیں۔ منع کر دیتے ہیں، قبول نہیں کرتے، اگر ہم صرف اسی عامل کو نظر میں رکھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ لوگ امامؑ سے یہ مطالبہ نہ کرتے تو امامؑ ان کے مقابلے میں نہ کھڑے ہوتے چونکہ انہوں نے یہ مطالبہ کر دیا اس لئے امامؑ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو یہ مطالبہ قبول نہیں کرتا ان لوگوں کے مقابلے میں ڈٹ گئے لیکن جب ہم تیسرے عامل امر بالمعروف و نہی عن

المنکر کو نظر میں رکھتے ہیں نہ تو کوفہ کی دعوت اور نہ بیعت کا تقاضا بلکہ خود امامؑ ان کے مقابلے میں قیام کرتے ہیں اور یہاں بیعت کا مطالبہ بھی پیچھے جا پڑتا ہے بلکہ غور کریں تو امامؑ ازخود ان لوگوں کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔ دراصل حالات کا بگاڑ، برائیوں کا پھیلاؤ، منکرات وممنوعات کا عام ہونا، خود امامؑ کے الفاظ میں حرام کا حلال ہونا اور آخر میں معاشرے کو بگاڑنے والے ناگفتہ بہ حالات امامؑ کو ان کے مد مقابل کھڑا کر دیتے ہیں اور آپ کو قیام پر مجبور کرتے ہیں۔ امامؑ کے قیام کی اہمیت اس تیسرے عامل سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ عامل ایک دوسری ہی شکل اختیار کر لیتا ہے، دوسرا ہی حساب کھول دیتا ہے اور اس بات کا نہایت اچھا اور اعلیٰ عامل حالات کا یہی پہلو ہے جس نے اس تحریک کو ایسی شائستگی عطا کر دی ہے کہ یہ ہمیشہ تاریخ کی پیشانی پر چمکتی رہے "امواتا ابد" تک زندہ رہے اور دنیا میں ایک دائمی عامل اور بے مثال تحریک بن کر رہے البتہ مزید خصوصیات کے ساتھ جو میں عرض کروں گا۔

یہ عامل اس تحریک کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے اور اس دلیل کی رو سے ہمیں چاہئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اسلام کے نقطہ نظر سے پہچاننے کی کوشش کریں کہ یہ کیا اصل ہے؟ یہ کیا چیز ہے؟ جو اس قدر بنیادی اور طاقتور ہے اور اسلامی نقطہ نظر سے اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام جیسے بہادر شخص کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اسلام کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دیں، اپنا خون بہائیں، اپنے رشتہ داروں کا خون بہائیں اور اپنی جان ایسی ہلاکت اور مصیبت میں ڈال دیں جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی تب ہم تقریباً تیرہ سال بعد امامؑ کے سامنے کھڑے ہو کر یوں گواہی دیتے ہیں:

" اشهد انک قد اقمت الصلاٰة و اتيت الزّكواة و امرت بالمعروف و نهيت عن المنكر و جاهدت فی الله حق جهاده حتی اتيک اليقين "۔ اس گواہی کے مفہوم پر ٹھیک ٹھیک غور کیجئے۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؑ نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ اس کے تمام شرائط کے ساتھ ادا کی۔ **"و امرت بالمعروف و نهيت عن المنكر"** آپ نے نیکی کی ہدایت کی اور بدی سے روکا یعنی آپؑ کی پوری تحریک نیکی کا حکم اور بدی کی ممانعت ہے۔ **"و جاهدت فی الله حق جهاده"** آپ نے خدا کی راہ میں جہاد کیا جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔

اب ایک نکتہ یہ ہے کہ ہم زیارت وارثہ میں کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں، ہم کس شخص کیلئے گواہی دیتے ہیں؟ ہم عام طور پر قاضی کے یہاں جا کر گواہی دیا کرتے ہیں۔ جب قاضی کے سامنے

کوئی بات ثابت نہیں ہوتی اور ہم اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: قاضی صاحب! میں گواہی دیتا ہوں کہ فلاں نے فلاں وقت فلاں عنوان کے تحت ان صاحب سے اتنی مقدار کی واپسی کا تقاضا کیا تھا، ہم اس وقت گواہی دیتے ہیں، ہم کس شخص کے سامنے گواہی دیتے ہیں؟ کیا خدا کے سامنے گواہی دیتے ہیں؟ کس کے حق میں؟ امام حسین علیہ السلام کے حق میں؟ معانی و بیان کے علماء ایک نکتہ کا ذکر کرتے ہیں جو بہت اعلیٰ ہے اور وہ یہ ہے کہ: بعض اوقات انسان کسی موقع پر کوئی بات اس لئے نہیں کہتا کہ سننے والا سمجھ جائے، اسے وہ بات سمجھائے بلکہ سننے والے کو یہ سمجھانے کیلئے کہتا ہے کہ میں اسے یوں سمجھ رہا ہوں۔ یہ بات بہت عام سی ہے، کبھی کبھی آپ کسی کے سامنے کسی بات کو گواہی دیتے ہیں، اس لئے نہیں کہ وہ سمجھ جائے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ خود یہ بات سمجھتا ہے بلکہ آپ اپنی گواہی سے اسے یہ سمجھانا چاہتے ہیں، اس کے سامنے اقرار کرتے ہیں تاکہ وہ جان لے کہ آپ یہ بات جانتے اور سمجھتے ہیں۔

اس مقام پر گواہی کے معنی اقرار کے ہیں، میں گواہی دیتا ہوں یعنی میں بھی ہر سمجھدار اور حقیقت جاننے والے آدمی کی طرح اس بات کا اعتراف کرتا ہوں اور یہ بات مانتا ہوں اے ابا عبد اللہ علیہ السلام! کہ آپ کی تحریک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تحریک تھی یعنی میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپؑ نے صرف اہل کوفہ کی دعوت پر قیام نہیں کیا، آپؑ تو ان کی دعوت سے پہلے ہی قیام کر چکے تھے، کوفیوں نے آپ کو بعد میں دعوت دی، میں گواہی دیتا ہوں، مانتا ہوں کہ آپ کی تحریک صرف یہ نہیں تھی کہ میں بیعت نہیں کرتا یعنی آپ کی تحریک صرف بیعت سے انکار کی تحریک نہیں تھی۔ آپ کی تحریک میں تو دوسری ہی بات شامل تھی، آپ نے اسلام کے ایک اصل جاری کر دیا اور وہ اصل امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نے حسینی تحریک کے مقام اور قدر کو بہت بلند کر دیا ہے۔ اس ایک خصوصیت بلکہ اور بھی دوسری خصوصیات کے علاوہ، میں ایک ایسی خصوصیت بیان کرتا ہوں جو پیغمبروں، اللہ کے ولیوں اور مومنوں کی تمام تحریکوں کو دوسرے انسانی رہبروں اور غیر رہبروں کی تحریک سے ممتاز کرتی ہے۔ امتیاز بخشتی ہے۔ وہ کیا ہے؟ انسان کے عمل کا ایک جسم ہوتا ہے اور ایک روح ہوتی ہے، ممکن ہے کہ میں اور آپ کوئی کام یکساں طور پر انجام دیں لیکن کس نقطہ نظر سے یکساں؟ اس نقطہ نظر سے کہ میرے کام کا جسم آپ کے کام کے جسم ایک جیسا ہے۔ فرض کیجئے ہم دونوں

آدمی نماز پڑھتے ہیں، ہم دونوں فلاں نیک کام میں پیسہ خرچ کرتے ہیں، میں سو روپے دیتا ہوں آپ بھی سو روپے دیتے ہیں، میں چار رکعت نماز پڑھتا ہوں آپ بھی چار رکعت نماز پڑھتے ہیں۔ ان کاموں کی ادائیگی میں ایک دوسرے کے مابین کوئی فرق نہیں ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ آپ جس خلوص نیت، خضوع اور خشوع، جس اخلاص و محبت، جس عشق اور جس روحانی جذبے سے سرشار ہوں اس سے میں نہ ہوں۔ یہ بات آپ کے کام کی قدر و قیمت کو میرے کام سے ہزار گنا بڑھا دیتی ہے۔ خدا کی راہ میں تو بہت سے لوگوں نے جہاد کیا لیکن "ضربة علی یوم الخندق افضل من عبادة الثقلین" کس لئے ہے؟ علی علیہ السلام کا ایک وار اتنی اہمیت حاصل کر جاتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ علی علیہ السلام کا ایک وار اتنی اہمیت حاصل کر جاتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ علیؑ وہاں پہنچ گئے تھے جہاں اہل عرفان کے قول کے مطابق "فنافی اللہ" ہو گئے تھے یعنی ان کے وجود میں انائیت اور خودی جیسی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی۔ اس حال میں جب دشمن آپ کے منہ پر تھوک دیتا ہے تو آپؑ اس کا سر کاٹنے سے رک جاتے ہیں کہ کہیں اس کے اس فعل سے پیدا ہونیوالا غصہ آپؑ کے عمل پر اثر انداز نہ ہو جائے، آپؑ کے عمل کی روح کو متاثر نہ کر دے، وہ چاہتے ہیں کہ اس مقام پر اس کا وجود باقی نہ رہے، ان کی روح میں صرف خدا کا وجود ہو۔ آپ یہ پہلو صرف انبیاء اور اولیاء کے مکتب میں دیکھیں گے۔ انبیاء کے مکتب کے علاوہ کسی اور مکتب میں ایسی بات نہیں پائیں گے۔

اس آیت میں جو ابتداء میں تلاوت کی گئی "التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناهون عن المنکر"۔ دوسرے چند لفظوں کے بعد "التائبون" کا لفظ آتا ہے یعنی خدا کی طرف پلٹنے والے۔ عرفاء کہتے ہیں کہ سلوک کی پہلی منزل توبہ ہے کیسی توبہ یعنی واپسی، جو شخص کسی دوسری راہ پر چلتا ہے وہ ایک بار حق کی راہ پر واپس آتا ہے، خدا کی طرف پلٹتا ہے "التائبون العابدون" توبہ کے بعد یہ لوگ خدا کے عبادت گزار ہو جاتے ہیں، خدا کی عبادت کرتے ہیں، غیر خدا کو نہیں پوجتے، خدا ان کے وجود پر حکومت کرتا ہے، خدا کے علاوہ ان کا کوئی حاکم نہیں ہوتا، یہ صرف خدا کا حکم مانتے ہیں، غیر خدا کا حکم نہیں مانتے، خدا کی اطاعت کرتے ہیں غیر خدا کی پیروی نہیں کرتے "الحامدون" یہ حمد کرتے ہیں لیکن خدا کے سوا کسی دوسری ہستی کی تعریف نہیں کرتے، دوسری ہستی کو مطلق اس لائق نہیں سمجھتے کہ اس کی مدح کریں، اسے سراہیں، اس کے گن گائیں،

یہ صرف خدا کی تعریف کرنے اور اسی کے گن گانے والے ہیں، "السائحون" سیاحت کرنے والے ہیں۔ سیاحت کے بارے میں تفسیروں میں مختلف بیانات ملتے ہیں، بعضوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد روزہ رکھنا ہے یعنی روحانی سیاحت جو روزے میں ہوتی ہے لیکن بہت سے محققین کی طرح علامہ طباطبائی بھی المیزان میں اسے نہیں مانتے۔ ایک گمان یہ ہے کہ وہ لوگ جو زمین کی سیر کرتے ہیں کیونکہ قرآن میں انسان کو زمین کی سیر کی دعوت دی گئی ہے، زمین کی کیسی سیر؟ دنیا کا مطالعہ، وہ سیر و سیاحت نہیں جس کا مقصد صرف تفریح اور من بہلاوا ہو! اسلام انسان کی زندگی کو اس سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہے، وہ صرف تماشائی کی حیثیت سے دنیا کی سیر کرتا پھرے البتہ اسلام ایسی سیاحت کی سفارش کرتا ہے جس میں انسان سوچے، غور کرے، سبق حاصل کرے: "قل سیروا فی الارض" یہ سبق اور سوچ و بچار ہے۔
"

وہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے، وہ انسانی معاشروں کے حالات کا مطالعہ کرنے والے، وہ آفرینش کائنات کے قوانین کا مطالعہ کرنے والے، وہ جو اپنے ذہنوں میں کثیر تعداد میں روشن خیالات رکھتے ہیں۔ اس کے بعد عبادت کے دو مظاہر بیان کرتی ہے "الراکعون الساجدون" وہ لوگ جو رکوع اور سجدے کی حالت میں اپنے خدا کی تسبیح پڑھتے ہیں، رکوع میں کہتے ہیں: "سبحان ربی العظیم و بحمدہ" سجدوں میں کہتے ہیں "سبحان ربی الاعلیٰ و بحمدہ" یہ "سبحان ربی العظیم و بحمدہ" اور "سبحان ربی الاعلی و بحمدہ" کہنے والے "الامرون بالمعروف و الناھون عن المنکر" ہیں۔ یہ ایسی روح، ایسے خیالات، ایسے روحانی سامان، ایسی روحانی پونجی کے ساتھ معاشرے کی اصلاح کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو پہلے خود نیک بن چکے ہیں بعد میں چاہتے ہیں کہ دوسروں کی اصلاح کریں، دوسروں کو نیک بنائیں۔ آمر معروف اور ناہی منکر یعنی مصلح، اصلاح کرنے والے سدھارنے والے۔ کیا غیر صالح مصلح ہوسکتا ہے؟ وہ لوگ جنہوں نے پہلے اپنی اصلاح کی ہے اپنے آپ کو ادب سکھایا اور تربیت دی ہے مصلح یعنی سدھارنے والے، اصلاح کرنے والے ہوسکتے ہیں۔

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں: "من نصب نفسہ للناس اماماً فعلیہ ان یبدأ بتعلیم نفسہ قبل تعلیم غیرہ و معلم نفسہ و مودبھا احق بالاجلال من معلم الناس و

مودبھم "۔ یعنی جو شخص اپنے آپ کو لوگوں کی رہنمائی کیلئے پیش کرتا ہے، لوگوں کا معلم اور مربی بنا کر پیش کرتا ہے، واعظ اور خطیب بنا کر پیش کرتا ہے، لوگوں کا ہادی اور رہبر بنا کر پیش کر کرتا ہے، اسے چاہئے کہ وہ سب سے پہلے اپنے آپ سے شروع کرے، پہلے اس نے آپ کو تعلیم دی۔ یہ سمجھ لے کہ خود اسکے اندر ایک جاہل موجود ہے، پہلے اس جاہل کو تلقین کرے جو خود اس کے اندر موجود ہے اور جس کا نام نفس امارہ ہے۔ یاد رکھئے کہ خود اس کے اندر ایک غیر تربیت یافتہ ہستی ہے پہلے اس کی تربیت اور تادیب کرے، پہلے اپنے نفس کو نصیحت کرے، ملامت کرے، اپنے نفس سے حساب لے، جب وہ اپنی درستی اور تہذیب کر کے نیک بن جائے تب اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کر سکتا ہوں، لوگوں کو وعظ دے سکتا ہوں، لوگوں کو تعلیم دے سکتا ہوں، لوگوں کی تربیت اور تادیب کر سکتا ہوں، معاشرے کا مصلح بن سکتا ہوں۔ آپؑ نے فرمایا: **الحق اوسع الاشیاء فی التواصف واضیقھا فی التناصف** " کیا یہ جملہ ہے! لوگ انہیں دل پر نقش کر لیں۔ فرمایا ہے حق اور عدالت کا میدان، بات کہتے، گفتگو کرتے، تقریر کرتے اور زبان سے کام لیتے وقت بہت وسیع اور کشادہ ہوتا ہے یعنی باتیں کرنے کیلئے حق کے میدان سے زیادہ وسیع کوئی میدان نہیں ہے، اگر انسان چاہے کہ حق کے متعلق ہر موضوع سے زیادہ لچھے دار تقریر کرے، فن لسانی سے کام لے، گفتگو کرے تو نہایت آزادی اور سہولت سے کر سکتا ہے لیکن جب عمل کا موقع آتا ہے تو پھر حق کے میدان سے زیادہ تنگ اور کوئی میدان نہیں ہے، اس وقت انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنا دشوار ہے، حق کے بارے میں باتیں بتانا جتنا آسان تھا عمل کا موقع آنے پر ایک قدم اُٹھانا بھی اتنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہاں قرآن بھی {**التائبون العابدون الحمدون السائحون الراکعون الساجدون**} کہنے کے بعد {**الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر**} کہتا ہے۔ یہ لوگ ہیں جو نیکی پھیلانے کی راہ پر چلتے ہیں بدی، اور بگاڑ کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں جو یہ صلاحیت رکھتے ہیں ۔"**وبشر المومنین** "یہاں مومنوں کو خوش خبری سنا دو کہ اگر وہ "تائب" (توبہ کرنے والے) اور
"

(سجدہ کرنے والے) ہو گئے اور اس کے بعد نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے والے بن گئے تو وہ کامیاب ہو جائیں گے اور اگر سب کچھ ہونے کے بعد بھی وہ نیکی کا حکم دیتے اور بدی سے روکتے بھی

تھے لیکن خود ان کا دامن صاف نہیں تھا، اگر دوسروں سے توبہ کرانے والوں نے خود توبہ کم کی تب بھی وہ کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا: "**لعن اللہ الآمرین بالمعروف التارکین لہ والناھین عن المنکر العاملین بہ**" خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جو دوسروں کو نیکی کی تلقین تو کرتے ہیں لیکن خود اس نیک کام کے خلاف کرتے ہیں اور ان لوگوں پر جو دوسروں کو برائیوں سے روکتے ہیں لیکن خود انہیں برائیوں پر عمل کرتے ہیں یعنی جو نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے خود "التائبون" نہیں ہیں "الساجدون" نہیں ہیں "الحمدون" نہیں ہیں "السائحون" نہیں ہیں "الراکعون" نہیں ہیں، جنہوں نے ابھی یہ مراحل اور منزلیں طے نہیں کی ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ وہ آمر معروف اور ناہی منکر بن جائیں خدا ایسے لوگوں پر لعنت کرے۔

عارفوں کی اپنی ایک اصطلاح ہے: وہ دعوی کرتے ہیں کہ سالک چار مختلف سیریں کرتے ہیں:

۱۔ **سیر من الخلق الی الحق**: یعنی دنیا اور فطرت کی طرف سے خدا کی طرف سیر۔

۲۔ **سیر بالحق فی الحق**: خود خدا کی ذات کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں۔

۳۔ **سیر من الحق الی الخلق**: خدا کی طرف سیر یعنی لوگوں کی ہدایت و رہبری کے لئے آنا۔

۴۔ **سیر بالحق فی الخلق**: دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں وہ شخص ایسی لیاقت رکھتا ہے کہ دوسروں کی مدد کر سکے، دوسروں کا ہادی اور رہنما ہو سکے، نیکی کا حکم دے سکے اور بدی سے روک سکے کیونکہ وہ خود اس منزل تک پہنچا ہے اور بعد میں اسے یہ حکم ملا ہے کہ وہ لوگوں کو اس مقام تک لے جائے جہاں وہ خود فائز ہوا ہے۔

معلوم ہوا کہ حسینی تحریک کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے یہ عظمت اور یہ قدر و قیمت حاصل ہوئی ہے۔ تو اس اصل کو پہچان لینا چاہیے کہ یہ اصل کتنی اہمیت رکھتا ہے جو امام حسینؑ اپنے آپ کو اس کی خاطر شہید کر دیتے ہیں اور وہ کتنا شائستہ ہے جو اس کی خاطر امام حسینؑ کی طرح قربان ہو جائے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وہ بے مثل اصل ہے جو اسلام کی بقا کا ضامن ہے۔ اصطلاح

فلسفہ میں "علت مبقیہ" ہے یعنی باقی رکھنے والا عامل ہے، واقعی اگر یہ اصل نہ ہوتو اسلام بھی نہ رہے۔ یہ مسلمانوں کی حالت کی برابر جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے۔ آیا کوئی کارخانہ، ماہر انجینئروں کی مسلسل جانچ پڑتال کے بغیر جو یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ اس کی کیا حالت ہے باقی رہ سکتا ہے۔ کیا یہ اصولی طور پر ممکن ہے کہ کوئی کارخانہ بدستور اپنے حال پر قائم رہے، ہم اس کے متعلق بالکل ہی نہ سوچیں اور پھر بھی وہ اپنی وضع پر چلتا رہے؟ ہرگز نہیں! یہی حال جامعہ کا ہے۔ ایک اسلامی جامعہ کا یہی طور ہے بلکہ سو درجے بلند و بالا۔ آپ کون سا انسان ایسا پیش کر سکتے ہیں جو معالجہ کا محتاج نہ ہو؟! یا تو انسان خود ہی اپنے جسم کا معالج ہو جو اس کا علاج کریں۔ آنکھ کا ماہر، کان، حلق ناک کا ماہر، مزاج کا ماہر، اعصاب کا ماہر ـــــ انسان ہمیشہ طرح طرح کے معالجوں پر نظر ڈالتا رہتا ہے تاکہ وہ اس کے جسم کا معائنہ کریں اور یہ دیکھیں کہ اس کی کیا حالت ہے۔ تو کیا پھر معاشرہ غور و فکر اور دیکھ بھال کا محتاج نہیں ہوتا؟ کیا جامعہ جانچ پڑتال نہیں چاہتا؟ کیا ایسا ممکن ہے؟ ہرگز نہیں! امام حسینؑ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر یعنی اس بنیادی اصل کی خاطر جو اسلامی جامعہ کی بقا کا ضامن ہے مارے گئے۔ یہ اصل اگر نہ ہوتو انجام معاشرہ پارہ ہو جاتا ہے، بکھر جاتا ہے، اس کا انجام جماعت کے ڈھانچے کا ٹوٹ جانا، نابودی اور بربادی ہے۔ ہاں! یہ اصل اتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں قرآن کی بہت سی آیات موجود ہیں۔ قرآن کریم کچھ قدیم معاشروں کا ذکر کرتا اور کہتا ہے کہ یہ بکھر گئے، ہلاک ہو گئے، تباہ و برباد ہو گئے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا موجب ان معاشروں میں اصلاح کی توانائی اور قوت نہ ہونا ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قوت نہ تھی بلکہ ان لوگوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا احساس بھی مردہ ہو چکا تھا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کون کون سی شرائط ہیں اور ہم کس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر سکتے ہیں؟ سب سے پہلے تو یہ بات ہے کہ "معروف" اور "منکر" کے کیا معنی ہیں؟ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کسے کہتے ہیں؟ اسلام نے یہ نہیں چاہا کہ "امر بالمعروف و نہی عن" کے موضوع کو مقررہ اشیاء جیسے عبادات، معاملات، اخلاقیات، گھریلو احاطے وغیرہ میں محدود کرے اس لئے ایک عام لفظ استعمال کیا ہے "معروف" یعنی ہر موقع پر (نیکی اور بھلائی کے ہر کام

میں)امر بالمعروف لازم ہے ۔اس کی ضد ہر برا کام ہے ،اس نے شرک یا فسق یا غیبت یا جھوٹ یا عیب جوئی یا تفرقہ اندازی یا سود یا ریا اور منافقت نہیں کہا بلکہ منکر کہا یعنی ہر چیز جو بری اور خراب ہے۔ "امر "یعنی حکم "نہی "یعنی ممانعت ،روک ،ٹوک ۔۔لیکن یہ حکم کیا ہے؟ کیا اس حکم سے لفظی حکم مراد ہے؟ کیا امر بالمعروف اور نا ہی عن المنکر صرف زبانی معاملہ ہے؟ کیا صرف زبان سے ہی نیکی کا حکم دینا چاہئے اور زبان سے ہی بدی کی ممانعت کرنا چاہیے؟ نہیں !امر بالمروف اور نہی عن المنکر کا تعلق دل اور ضمیر سے ہے ،زبان سے ہے ،ہاتھ اور عمل سے بھی ہے ۔آپ کو چاہیے کہ اپنے پورے وجود کے ساتھ آمر معروف اور نہی عن المنکر ہوں ۔حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے لوگوں نے پوچھا کہ قرآن نے روئے زمین کے بعض جانداروں کے لئے کہا کہ وہ مردہ ہیں ۔اس کا کیا مطلب ہے؟"میت الا حیاء" زندوں میں مردہ کون ہے اور کیسے ہے؟ آپ نے جواب دیا: انسانوں کے کئی طبقے ہیں ۔بعض لوگ جب منکرات کے دیکھتے ہیں تو ان کے دل پر اثر ہوتا ہے ،ان کی ہڈیوں کا گودا تک جلنے لگتا ہے ،ان کی زبان کھل جاتی ہے ،وہ تنقید کرنے لگتے ہیں ،کہہ اٹھتے ہیں کہ اس منکر سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے اسے انجام دیتے ہیں ۔آپ نے فرمایا: یہ تمام زندوں کا ایک زندہ ہے ۔بعض دوسرے ایسے ہوتے ہیں کہ جس وقت منکرات کو دیکھتے ہیں ان کے دل سلگ اٹھتے ہیں ،زبان سے کہنے لگتے ہیں ،چیخنے چلانے لگتے ہیں ،فریاد اور احتجاج کرتے ہیں ،نصیحت کرتے ہیں ،،وعظ و پند دیتے ہیں ۔لیکن جب عمل کی باری آتی ہے تو وہ میدان میں نہیں آتے ۔آپؑ نے فرمایا: اس میں بھی زندگی کی دو تین خصلتیں ملتی ہیں لیکن زندگی کی ایک خصلت نہیں ملتی ۔

تیسری قسم: اس شخص کے دل میں آگ لگ جاتی ہے لیکن صرف جوش میں آتا ہے ،صرف ناخوش ہوتا ہے ۔مثلاً اخبار پڑھتا ہے ۔دیکھتا ہے لوگ عید (نوروز) کے دنوں میں امام حسینؑ کا احترام قائم نہیں رکھتے ۔اخبارات پروپیگنڈا کرتے ہیں ،ریڈیو چیختا ہے کہ اس وقت کو تفریح میں صرف کرو! کیا بیٹھے ہوئے ہو ،تہران کے آدھے لوگ چلے گئے ،مختلف جگہوں پر پہنچ چکے ہیں ،تمہاری دس دن کی تعطیل ہے ۔یہ سب پڑھتا اور سنتا ہے ،دل میں کہتا ہے ،یہ کیسے لوگ ہیں ؟ یہ امام حسینؑ سے کیوں لڑتے ہیں؟ کس لئے ایک شخص بھی ایک لفظ کسی اخبار میں یا دوسری جگہ نہیں لکھتا کہ بابا تفریح کا وقت اور بھی ہے ۔

ہمارا دعوی ہے کہ امام حسینؑ کا ہماری روح سے تعلق ہے۔ہم نے اس مکتب سے فائدہ اٹھالیا ہے ۔اور اٹھا رہے ہیں ۔ یہ ملک امام حسینؑ کا ملک ہے، شیعہ ملک ہے، امام حسینؑ اس قوم کا نعرہ ہیں، ملک کا نعرہ ہیں، یہ امام حسینؑ کی توہین ہے کہ آپ ان دنوں میں سیر وتفریح کے لئے چلے جائیں! وہ اخبار میں پڑھتا ہے جوش میں بھی آتا ہے لیکن اس کے لئے نہیں ہے کہ اپنے دوست سے بھی یہ کہے کہ امام حسینؑ کا احترام قائم رکھ! امام حسینؑ کے سوئم تک ٹھہرا رہ۔کم سے کم اباعبداللہ کے احترام کی اتنی سی قدر محفوظ رکھ ،ہم نے امام حسینؑ کی حفاظت نہیں کی ہے، امام حسینؑ ہیں کہ جنہوں نے اب تک ہماری حفاظت کی ہے ۔علامہ اقبال کے قول کے مطابق: "مسلمانوں نے کسی وقت بھی اسلام کی حفاظت نہیں کی ہے۔ یہ ہمیشہ اسلام ہی رہا ہے کہ جس نے مسلمانوں کی نگہداری کی ہے۔" ملک کو جس وقت بھی کوئی سنگین خطرہ لاحق ہوتا ہے تب آپ دیکھیں گے کہ لوگوں کو حضرت علی ابن ابی طالبؑ اور نہج البلاغہ یاد آتے ہیں، امام حسینؑ یاد آتے ہیں۔

ہم ان لوگوں سے ہیں کہ: "فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ" (عنکبوت۔ ٦٥)، کچھ لوگ جو کشتی میں سوار ہوتے ہیں جس وقت طوفان آتا ہے تو نہایت خلوص سے یا اللہ یا اللہ، یا خدایا خدایا کی آوازیں بلند کرنے لگتے ہیں۔ وہ اس وقت خدا کے سوا اور کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچتے لیکن جس وقت خدا نہیں بچا لیتا ہے اور ساحل نجات تک پہنچا دیتا ہے۔جس وقت وہ خطرے سے دور ہوجاتے ہیں تو بالکل بھول جاتے ہیں، خدا کے منکر ہوجاتے ہیں، خدا کا شریک ٹھہرا لیتے ہیں۔کیا ہم نے اپنے اسی ملک میں نہیں دیکھا کہ جو لوگ امام حسینؑ اور حضرت علی ابن ابی طالبؑ کا نام بھی نہیں لیتے تھے۔آج سے پچیس سال پہلے لے رہے تھے ،جیسے ہی مصیبت سے نجات ملی تو کہنے لگے ہمارے یہاں بابک خرم دین تھا، المقنع تھا، مازیار تھا! جس وقت اس قوم کو کوئی خطرہ اور پیش ہوتا تو پھر بابک خرم دین کس جہنم میں ہوتا؟ امام حسینؑ سے لڑتے ہیں ۔ان کے مقابل آئیڈیلز سجاتے ہیں! انہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آتی! بجائے اس کے کہ اپنے بیٹے کا نام "حسین" رکھ کر فخر کریں "رستم" "فریدون" اور "جمشید" و فرشید رکھتے ہیں۔۔۔!

خدا کی قسم یہ سب کچھ اسلام کے خلاف جنگ ہے اسلام کو مار ڈالنا ہے۔دین کے شعار کو زندہ رکھیئے، دین کی شعار میں سے ایک بچوں کے "نام" ہیں۔میری سمجھ میں لوگوں کی ایک بات نہیں آتی کہ

فلاں نام رواج سے اتر گیا، پرانا ہو گیا۔ کیا مطلب؟ کیا نام میں بھی نیا پن اور پرانا پن ہوتا ہے؟ چونکہ فلاں خادمہ کا نام فاطمہ ہے اس لئے فاطمہ خادمہ کا نام ہے۔ نہایت عجیب بات ہے، اب ہم اپنی بیٹیوں کا نام فاطمہ نہ رکھیں!۔ یہ بھی ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک منزل یہ بھی ہے۔ کہ آپ اپنے بیٹوں کے اسلامی نام رکھیئے (یہ امر بالمعروف ہے) اور غیر اسلامی ناموں کی مخالفت کیجئے (یہ نہی عن المنکر ہے) اپنے اداروں کے نام اسلامی رکھئے، آپ مدرسہ کی بنیاد رکھتے ہیں، شفاخانہ بناتے ہیں، ان میں یہ بات مشترک رکھیئے۔ اسلامی نام زندہ رکھئے۔ اسلام کی زبان زندہ رکھئے، عربی زبان ایک قوم کی زبان نہیں ہے، اسلام کی زبان ہے، عربی زبان عرب کی زبان نہیں ہے اسلام کی زبان ہے۔ اگر قرآن نہ ہوتا تو دنیا میں اس زبان کا بھی مطلق وجود نہ ہوتا۔ ہمارا اہم فریضہ یہ ہے کہ ہم اس زبان کی حفاظت کریں۔ جو ثقافت اور جو تہذیب زندہ رہنا چاہتی ہے اس کی زبان کو زندہ رہنا چاہیے، اگر اس کی زبان مر گئی تو سمجھئے کہ وہ خود بھی مر گئی۔ اس کھلم کھلا لڑائی پر جو آپ عربی زبان کے خلاف دیکھتے ہیں آپ کو چونکنا اور سمجھنا چاہئے، شعور رکھئے، عقل رکھئے۔ خدا کی قسم یہ اسلام سے جنگ ہے، یہ حروف تہجی (الف، ب) سے لڑائی نہیں ہے۔ خدا کی قسم ہم پر عربی زبان کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اسلام کی اس زبان کی حفاظت کریں، اسے بچائیں۔ آپ کی کسی نے مزاحمت کی ہے؟ کلاسیں بنائیں اور جو عربی جانتے ہیں انہیں بلایئے۔ آپ خود، آپ کے اہل خانہ اس میں شرکت کریں، آپ کو بہت فائدہ ہوگا کیونکہ یہ بھی ایک دنیا کی زندہ زبان ہے۔ یہ جو انگریزی زبان والوں نے اپنی زبان کی اشاعت کی اور اسے اس حد تک ہم پر تھوپا اور مسلط کیا کہ وہ ہمارے گھروں کے اندر بھی نفوذ کر گئی ہے آخر کس لئے؟ کیا ان کے دل ہمارے حال پر کڑھتے تھے؟ یہ صرف اس لئے ہوا کہ وہ اپنی عادات ہم پر تھوپیں اپنے افکار کو ہم پر مسلط کریں، اپنی ثقافت کو ہم پر مسلط کریں اپنے رواج کو ہمارے روح میں ڈالے تا کہ ہماری روح کو حقیر و ناچیز بنا دیں۔

ہم مسلمان کتنے غافل تھے اور کتنے غافل ہیں؟ نہ صرف ہم ایرانی بلکہ دنیائے اسلام میں جس جگہ انسان پہنچتا ہے۔ یہ دیکھتا ہے کہ صدیوں سے سو رہے ہیں۔ خوش قسمتی سے رفتہ رفتہ مسلمان جاگنے لگے ہیں۔ کس قدر افسوس کی بات یہ جس وقت دو مختلف ملکوں کے دو مسلمان مکہ یا مدینہ میں ملتے ہیں تو ایکدوسرے کی زبان نہیں سمجھ پاتے مجبوراً انگریزی زبان کے وسیلے سے کام لیتے ہیں۔ یہ تین سو چار سو

سال کی اسکیمیں ہیں ۔کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ہم ان اسکیموں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں؟{کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر} یہ عظیم فریضہ (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) دورکن اور بنیادی شرطیں رکھتا ہے ایک رکن اور شرط رشد، آگاہی اور بصیرت ہے۔ میں نے جو ابھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا تو لازمی طور پر ہم سب نے یہ سوچا کہ اچھا یہاں سے چلیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا ہے اور کس طرح کیا جاتا ہے؟ ابھی تک تو ہمارا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لوگوں کے لباس کے بٹن اور جوتے کے بندوں کے متعلق رہا، لوگوں کے سر کے بالوں اور لباس کی سلائی کے آس پاس رہا ہے! ہم معروف کو کیا پہچانیں کہ کیا ہے؟ منکر کو کیا جانیں کہ کیا ہے؟ ہم کبھی معروف کو منکر اور کبھی منکر کو معروف بنا دیتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم جاہل لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کریں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام سے کیسے منکرات نہیں ہوئے ؟ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیلئے آگاہی اور بصیرت چاہیے، دانائی و بینائی، کارآزمودہ چاہیے، حقائق شناسی، نفسیات اور جامعہ شناسی چاہیے، تاکہ انسان سمجھ لے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کس طرح کرے؟ یعنی نیکی کی راہ کو پہچانے اور جانے کہ نیکی کہاں ہے؟ منکر کو جڑ سے اکھاڑ دے کہ اس کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اسی لئے تو آئمہ دینؑ نے فرمایا: بہتر ہے کہ جاہل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے کیوں؟ "لانه مایفسده اکثر مما یصلحه"

وجہ یہ ہے کہ جس وقت جاہل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بہتر کرنا چاہتا ہے تجزیہ کار نہ ہونے کی وجہ سے بدتر کر بیٹھتا ہے، اس ضمن میں بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ شاید آپ کہیں ہم جاہل ہیں اس لئے ہم پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب نہیں رہا! آپ کو جواب دیا جا چکا ہے قرآن فرماتا ہے: {لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَا مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ} کہ ہلاک ہونے والا واضح دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور زندہ رہنے والا واضح دلیل کے ساتھ زندہ رہے (انفال: ۴۲)

اور ایک اور مقام پر فرمایا:

{لِأَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ} تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کسی حجت کی گنجائش نہ رہے (نساء: ۱۶۵)

ایک معصوم سے پوچھتے ہیں: بعض لوگ جاہل ہوتے ہیں، قیامت میں ان کے ساتھ کیا سلوک

ہوگا؟ آپ نے فرمایا: اس دن ایک عالم کو لائیں گے جس نے عمل کیا ہے، اس سے پوچھیں گے تو نے عمل کیوں نہیں کیا؟ جواب نہیں بن پڑتا وہ اپنے شرمناک اور خوفناک مقدر سے دوچار ہوگا۔ ایک آدمی کو لائیں گے اور پوچھیں گے تو نے عمل کیوں نہیں کیا؟ وہ کہے گا میں نہیں سمجھ سکا، میں نہیں جان پایا! وہ کہیں گے: "ھلا تعلمت" میں نہیں جانتا۔ میں نہیں سمجھتا بھی کوئی عذر ہوا؟ خدا نے عقل کس لئے پیدا کی ہے؟ اس لئے کہ تو سمجھے، جستجو کرے، تحقیق کرے۔ تجھے تو ان لوگوں میں سے ہونا چاہیے کہ جو نہ صرف اپنے ہی زمانے کے حالات سمجھیں بلکہ آئندہ کے حالات بھی سمجھیں امیر المومنینؑ نے فرمایا:۔ "ولا نتخوف قارعةً حتی تَحُلَّ بنا" ہمارے لوگ نادان رہے ہیں۔ وہ ان بلاؤں کو جو ان پر نازل ہوتی ہیں اس وقت تک نہیں پہچان پاتے جب تک کہ وہ ان کے سامنے نہ آجائیں، ان میں پیش بینی نہیں ہے۔ پیش بینی کیوں نہیں ہے؟ انہیں پہلے سے دیکھ اور سمجھ لینا چاہیے۔ انہیں نہ صرف اپنے زمانے کے حالات اور طور طریقوں سے آگاہ ہونا چاہیے بلکہ معاشرے کو اس حد تک پہچان لینا چاہیے کہ جو مصیبتیں مستقبل میں پیش آنے والی ہوں ان کی تشخیص کرلیں کہ پچاس سال بعد ایسا ہوگا۔ {وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ}۔ ہم نے ابراہیم کو پہلے سے ہی عقل کامل عطا کردی تھی۔ (انبیاء۔۵۱)

امام حسینؑ کی تحریک کو جو چیز زیادہ اہمیت بخشتی ہے وہ روشن بینی ہے۔ روشن بینی کا کیا مطلب ہے؟ یعنی امام حسینؑ نے اس روز کچی اینٹ میں وہ چیزیں دیکھ لیں جو دوسرے لوگ آئینے میں بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہم آج بیٹھے ہوئے اس زمانے کے حالات کی تشریح کررہے ہیں لیکن جو لوگ اس زمانے میں موجود تھے وہ اس طرح نہیں سمجھ پائے جس طرح امام حسینؑ سمجھ رہے تھے۔

ہم آج خدا کی راہ کے اس مجاہد، اس آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر اور اس ہستی یعنی حضرت عباسؑ کا ذکر خیر کرتے ہیں جن سے امام حسینؑ بہت زیادہ راضی تھے۔ اس زمانے میں آج کے سے رابطے نہیں تھے شام میں جو حادثات وواقعات گزر جاتے تھے ان کی کوفہ یا مدینہ کے رہنے والوں کو بہت دیر میں خبر ہوتی تھی اور کبھی کبھی خبر ہوتی بھی نہیں تھی، اس کا بہترین ثبوت مدینہ والوں کا قصہ ہے۔ امام حسینؑ مدینہ میں قیام کرتے ہیں، بیعت نہیں کرتے، مکہ چلے جاتے ہیں، اس کے بعد بہت سے واقعات پیش آتے ہیں یہاں تک کہ وہ شہید ہوجاتے ہیں۔ مدینہ کے عوام بیدار ہوکر اپنی آنکھیں مل مل کے چونکتے ہیں۔ ارے! امام حسینؑ شہید ہوگئے؟ کیوں؟ دارالخلافت شام کو چل کر دیکھیں تو یہ قصہ کیا

ہوا؟

اس کام کے لئے سات آٹھ آدمیوں کی ایک جماعت تیار کرتے ہیں، وہ شام جاتے ہیں، وہاں کافی دن تک رہتے ہیں، تحقیق کرتے ہیں یہاں تک کہ خلیفہ سے بھی ملتے ہیں، وہاں کے حالات اور طور طریقے اچھی طرح دیکھتے ہیں، واپس آجاتے ہیں۔ جس وقت لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ قصہ کیا ہوا؟ تو کہتے ہیں یہ نہ پوچھو! ہم جتنے دن تک شام میں رہے ڈرتے ہی رہے کہ اب آسمان سے پتھر برستے ہیں اور اب برستے ہیں اور ہم اب فنا ہوئے جاتے ہیں۔ وہ بات بھی جوابا عبداللہ نے کہی "**وعلی السلام السلام اذقد بلیت الامة براع مثل یزید**" سمجھتے ہیں اور مانتے کہ سچ کہا امام حسینؑ نے۔ لوگوں نے پوچھا آخر کیا قصہ ہوا؟ وہ بولے بس ہم تم سے اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس شخص کے پاس سے آرہے ہیں جو اعلانیہ شیراب پیتا ہے، کھلم کھلا کتے پالتا ہے، بندر پالتا ہے، ہر گناہ کرتا ہے یہاں تک کہ انہوں نے اپنی زبان میں کہا اپنی ماں سے بھی زنا کرتا ہے، اپنی محرم عورتوں سے زنا کرتا ہے۔ وہ لوگ امام حسینؑ کی آخری پیش بینی کو سمجھ گئے کہ امام حسینؑ ان باتوں کو پہلے دن سے جانتے تھے۔ پہلے دن سے۔ عاشور کے دن بھی آپؑ نے فرمایا تھا کہ یہ مجھے مار ڈالیں گے لیکن میں آج تم سے کہے دیتا ہوں کہ میرے قتل کے بعد یہ ہرگز اپنی حکومت جاری نہیں رکھ سکیں گے، آل سفیان چلی گئی۔ آل ابوسفیان تو بہت ہی جلدی چلی گئی بلکہ آل امیہ بھی اپنی حکومت قائم نہ رکھ سکی کیونکہ بعد میں بنی عباس نے اسی بنیاد پر آکر تو ان سے خلافت چھینی اور پانچ سو سال تک حکومت کی۔ ایسی صورت میں جبکہ کربلا کے حادثے کے بعد بنی امیہ کی حکومت برابر ڈگمگاتی رہی اس واقعے کا اس سے اچھا اور زیادہ کیا اثر ہوسکتا ہے کہ خود بنی امیہ میں اس نے مخالف پیدا کردیے اور روحانی قوت کو افزائش بخشی۔

اس ظالم ابن زیاد کا عثمان بن زیاد نامی ایک بھائی تھا۔ عثمان نے آکر اپنے بھائی سے کہا: "اے میرے بھائی میرا جی چاہتا تھا کہ زیاد کی تمام اولاد مفلسی، ذلت، نحوست اور بدقسمتی میں مبتلا ہوجاتی لیکن ایسا گناہ ہمارے خاندان میں نہ ہوتا" اس کی ماں مرجانہ ایک فاحشہ عورت ہے لیکن جب اس کے بیٹے نے یہ کام کیا تو اس نے کہا: اے بیٹے! تو نے یہ کام تو کرلیا لیکن یاد رکھ کہ تو بہشت کی خوشبو نہیں سونگھ سکے گا۔ مروان ابن حکم کو جواز لی اور ابدی شقی ہے ایک بھائی ہے جس کا نام یحیٰ بن حکم ہے یزید کی محفل میں یحیٰ معترض ہوکر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور کہنے لگا "**سبحان اللہ! اولاد سمیہ**" (یعنی زیاد کی ماں کی اولاد

) سمیہ کی بیٹیاں تو قابل احترام ہوں لیکن تو نے آل پیغمبرؐ کو اس حالت سے اس مجلس میں حاضر کر دیا ہے؟ دیکھئے! حسینی آواز انہیں کے گھروں سے اٹھی۔

آپ نے یزید کی بیوی ہند کا قصہ بھی سنا ہوگا کہ یزید کے گھر میں سے نکلی اور ایک معترضہ کی حیثیت سے اس حالت میں آئی کہ یزید انکار کرنے اور یہ کہنے پر مجبور ہو گیا میں کام کے لئے مطلق رضا مند نہیں تھا، یہ کام میں نے نہیں کیا ہے، عبیداللہ ابن زیاد نے اپنی مرضی سے کیا ہے۔ امام حسینؑ کی آخری پیش بینی یہ تھی۔ یزید اس کے بعد دو تین سال تک حکومت کرے گا اور مر جائے گا، اس کا بیٹا معاویہ بن یزید جو اس کا ولی عہد اور خلیفہ ہے اور معاویہ نے جس کی خاطر اس رنگ ڈھنگ کی بنیاد رکھی تھی چالیس دن گزرنے کے بعد منبر پر جا کر بولا: اے لوگو! میرے دادا معاویہ نے حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے جنگ کی اور حق میرے دادا کی طرف نہیں حضرت علیؑ کی طرف تھا۔ میرے باپ یزید نے امام حسینؑ سے جنگ کی جبکہ حق میرے باپ کی طرف نہیں امام حسینؑ کی طرف تھا میں ایسے باپ سے بیزاری چاہتا ہوں اور اپنے آپ کو خلافت کا سزاوار نہیں سمجھتا۔ میں اس غرض سے کہ اپنے باپ اور دادا کے گناہوں کا مرتکب نہ ہوں اعلان کرتا ہوں کہ خلافت سے کنارہ کش ہوتا ہوں۔ یہ امام حسینؑ کی قوت تھی۔ حقیقت کی قوت تھی جس نے دوست اور دشمن سے پر اثر ڈالا۔

امام صادقؑ نے فرمایا: "**رحم اللہ عمی العباس لقد آثر و ابلی بلاء حسناً**" خدا ہمارے چچا حضرت عباسؑ پر رحمت نازل کرے، انہوں نے کیسا اچھا امتحان دیا، ایثار کیا اور بہت بڑی آزمائش جھیلی۔ ہمارے چچا حضرت عباسؑ کا مقام خدا کے نزدیک ایسا ہے جس پر تمام شہداء رشک کرتے ہیں۔ اتنی شرافت نیت کی اتنی پاکیزگی اور اس قدر جاں نثاری! ہم صرف پیکر عمل کو دیکھتے ہیں عمل کی روح پر نظر ڈالتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ بھی کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ عاشور کی رات ہے حضرت عباسؑ، امام حسینؑ کی خدمت میں بیٹھے ہوتے ہیں اسی وقت دشمن کا ایک سردار آتا ہے اور آواز دیتا ہے: عباسؑ ابن علیؑ اور ان کے بھائیوں سے کہہ دو کہ یہاں آئیں۔ حضرت عباسؑ سنتے ہیں لیکن سنی ان سنی کر دیتے ہیں پرواہ نہیں کرتے۔ امام حسینؑ کے سامنے ادب سے بدستور بیٹھے ہوئے ہیں آقا نے ان سے فرمایا: یہ فاسق ہے تو کیا اسے جواب تو دو۔ آپؑ باہر آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ شمر ابن ذی الجوشن ہے۔ وہ مادر حضرت عباس کی طرف سے دور کا رشتہ رکھتا تھا کیونکہ وہ اور مادر حضرت عباسؑ دونوں ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے

ہیں جس وقت وہ کوفہ سے چلا ہے تو حضرت ابوالفضل العباسؑ اور ان کے مادری بھائیوں کے لئے ایک اما ن نامہ لیتا آیا ہے، اپنے خیال سے اس نے ایک خدمت انجام دی ہے۔ جس وقت اس نے اپنی بات کہی حضرت عباسؑ نے جھڑک دیا۔ آپ نے فرمایا: خدا تجھ پر اور اس شخص پر لعنت کرے جس نے یہ امان نامہ تیرے ہاتھ بھیجا ہے۔ تو نے مجھے کیا سمجھا ہے؟ تو نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے؟ تو نے یہ خیال کیا ہے کہ میں ایسا شخص ہوں جو اپنی جان بچانے کی خاطر اپنے امام اور بھائی حسینؑ ابن علیؑ کو یہاں چھوڑ کر تیرے پیچھے چلا آؤں گا؟ میں جس گود میں پلا ہوں اور میں نے جس چھاتی سے دودھ پیا ہے اس نے مجھے ایسی تربیت نہیں دی ہے۔

حضرت علیؑ کے جناب ام البنین سے چار بیٹے ہیں مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت علیؑ خاص طور پر اپنے بھائی عقیل سے کہتے ہیں میرے لئے ایک بیوی کا انتخاب کرو جو "ولدتها الفحوله" بہادروں کی نسل سے ہو، جس نے بہادروں سے ورثہ پایا ہو۔ "لتلد نی ولدا شجاعا" میں چاہتا ہوں کہ اس سے میرا ایک بہادر بیٹا پیدا ہو۔ بلا شبہ اس گفتگو میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا کہ اس سے حضرت علیؑ مقصود و منشا کیا ہے لیکن جو لوگ حضرت علیؑ کی پیش بینی کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں، آقا سے عرض کرتے ہیں یہ خاتون ویسی ہیں جیسی آپ چاہتے ہیں۔ ان خاتون سے چار بیٹے پیدا ہوئے جن میں سے سب سے بڑے ابالفضل العباسؑ ہیں۔ چاروں بیٹے کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے ساتھ رہتے ہیں اور شہید ہو جاتے ہیں جس وقت بنی ہاشم کی باری آئی حضرت ابالفضل العباسؑ نے جو سب سے بڑے بھائی تھے اپنے بھائیوں سے کہا: اے میرے بھائیو! میرا دل چاہتا ہے کہ تم مجھ سے پہلے میدان جنگ میں لڑنے کے لئے جاؤ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ بھائی کی شہادت کا اجر سمجھ لوں وہ بولے جیسا آپ کا حکم ہو۔ تینوں شہید ہو گئے بعد میں ابالفضل العباسؑ نکلے ان بزرگ خاتون (جناب ام البنین) کو جو اس وقت زندہ تھیں لیکن کربلا میں موجود نہیں تھیں اپنے چاروں نیک بیٹوں کی شہادت کا علم ہوا تو ان کے سوگ میں بیٹھ گئیں۔ انہیں مدینہ میں خبر ملی کہ تمہارے چاروں بیٹے امام حسینؑ کی خدمت میں شہید ہو گئے وہ ان بیٹوں کے لئے فریاد و ماتم کرتی رہتی تھیں کبھی عراق کے راستے پر اور کبھی بقیع میں جا بیٹھتی تھیں اور دل دہلا دینے والے بین کرتی تھیں۔ دوسری خواتین بھی ان کے گرد جمع ہو جایا کرتی تھیں۔

مروان بن حکم جو مدینہ کا حاکم تھا سخت دشمنی اور سنگدلی کے باوجود وہاں آجایا کرتا تھا، کھڑا ہو جایا کرتا تھا اور رویا کرتا تھا۔ حضرت ام البنین کا ایک نوحہ یہ ہے:

لا تدعونی ویک ام البنین تذکرینی بلیوث العربین
کانت بنون لی ادعی بھم والیوم اصبحت ولا من بنین

اے بی بیو! میں یہ چاہتی ہوں کہ اب تم مجھ "ام البنین" کے لقب سے نہ پکارو کیونکہ "ام البنین" بیٹوں کی ماں، بہادر بیٹوں کی ماں کو کہتے ہیں۔ مجھے اب اس نام سے نہ پکارنا کیونکہ تم جس وقت مجھے اس نام سے پکارو گی مجھے اپنے بہادر بیٹوں کی یاد آئے گی اور میرے دل کی آگ جاگ اٹھے گی میں ایک دن "ام البنین" تھی لیکن اب "ام البنین" اور بیٹوں کی ماں نہیں ہوں۔ حضرت ابالفضل العباس کے لئے بھی ایک خصوصی مرثیہ ہے:

یامن رأی العباس کر علی جماھر النقد ووراہ من ابناء حید ر کل لیث ذی لبد
انبئت ان ابنی اصیب براسہ مقطوع ید ویلی شبلی وامال براسہ ضرب العمد
لو کان سیفک فی یدیک لمادنی منہ احد

آپ فرماتی ہیں: اے وہ آنکھ جو کربلا میں موجود تھی اور وہ منظر جب میرا عباس (میرا شیر بچہ) حملہ کرتے تھا دیکھ رہی تھی تو نے دیکھا ہے! اے لوگو جو وہاں موجود تھے! مجھ سے ایک قصہ بیان کیا ہے میں نہیں جانتی کہ یہ قصہ سچ ہے یا نہیں؟

"انبئت ان ابنی اصیت براسیہ مقطوع
" مجھے

ایک جانگداز خبر ملی ہے نجانے صحیح ہے یا نہیں؟ مجھ سے کہا گیا ہے کہ تمہارے فرزند کے پہلے تو ہاتھ کاٹے گئے پھر جب تیرے فرزند کے ہاتھ نہیں رہے تو ایک لعین شقی نے آکر اس کے سر پر لوہے کا گرز مارا "ویلی علی شبلی امال براسیہ ضرب العمد" افسوس صد افسوس! کہتے ہیں کہ میرے شیر بچے کے سر پر فولادی گرز لگا۔ پھر فرماتی ہیں: اے عباس! میرے کلیجے کے ٹکڑے! میرے پیارے فرزند میں خود جانتی ہوں کہ اگر تیرے بدن میں ہاتھ ہوتے تو کوئی شخص تیرے نزدیک کی بھی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مراحل

" التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنْ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللهِ وَبَشِّرْ الْمُؤْمِنِينَ"

(یہ لوگ) توبہ کرنے والے، عبادت گزار، ثنا کرنے والے، (راہ خدا میں) سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کی دعوت دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے ہیں اور (اے رسول) مومنین کو خوشخبری سنا دیجیے (توبہ: ۱۱۲)

علمائے اسلام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے درجات اور اقسام کے قائل ہیں۔

پہلا مرحلہ: قطع تعلق و دوری اختیار کرنا

انہوں نے کہا نہی عن المنکر کا پہلا درجہ اور مرتبہ ہجر اور اعراض ہے یعنی ترک اور بے اعتنائی جس وقت آپ کسی ایک فرد یا افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ منکرات کے مرتکب ہو رہے ہیں، برے کام کر رہے ہیں تو ان سے مخالفت کے طور پر ان کی شخصیت سے نہیں بلکہ ان کے برے کام کی مخالفت کے طور پر اور اس غرض سے کہ آپ اسے یا انہیں برے کام سے روکیں ان سے بے اعتنائی برتتے ہیں، ان سے دوری اختیار کرتے ہیں یعنی ان سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک شخص آپ کا رفیق اور دوست ہے، آپ کے اس کے ساتھ بہت گہرے تعلقات ہیں، ایک دوسرے کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ ہیں، آپ کے باہمی تعلقات دوستانہ ہیں۔ ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے ہیں، گرم جوشی سے ملتے ہیں سفر میں ساتھ ساتھ جاتے ہیں ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیتے ہیں۔ ایک وقت آپ کو یہ خبر ملتی ہے کہا آپ کا یہی ساتھی اور دلی دوست فلاں برا کام کر بیٹھا ہے، فلاں برا کام کرتا ہے، فلاں گناہ کا مرتکب ہوا ہے، فلاں قطعی اور مسلم گناہ کو

انجام دیتا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک درجہ درحقیقت ایک قسم کی تنبیہ جو کئی موارد میں کی جاسکتی ہے یہ ہے کہ آپ اسے اپنی سرد مہری دکھایئے لاتعلقی کا اظہار کریں اور گذشتہ کی دوستانہ سلوک کو چھوڑ دیں، یہ خود ایک قسم کی تنبیہ ہے بلاشبہ انسان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معاملے میں منطق سے بھی کام لینا چاہیے، اس کا عمل منطق کے لحاظ سے درست ہونا چاہیے یہ ایسے موقع پر ہے کہ اگر آپ اس شخص سے تعلق ختم کر لیتے ہیں۔ جس سے آپ دلی دوستی رکھتے تھے، اس سے بے اعتنائی برتتے ہیں تو آپ کا یہ عمل اس کے لئے تنبیہ ہوگا اور تنبیہ ہی سمجھا جائے گا یعنی ایک قسم کی جھڑکی اور ذہنی سزا شمار ہوگا اور آپ کا یہ عمل اسے برے کام سے روکنے میں ضرور اثر انداز ہوگا ورنہ ایسے موقعے بھی ہوتے ہیں کہ کوئی شخص، آپ کا بیٹا، آپ کا دوست، کوئی جوان کسی بری عادت میں مبتلا ہوگیا ہے اور آپ کے اس سے تعلقات پہلے سے معمول کے مطابق چلے آرہے ہیں۔ اب جو آپ اس تعلق کو ختم کر لیتے ہیں تو وہ اس کا خیر مقدم کرتا ہے تاکہ وہ بھی آپ سے قطع تعلق کرے اور زیادہ آزادی سے منکرات اور برے افعال کے پیچھے دوڑنے لگے۔ اس موقع پر آپ کا اس سے قطع تعلق نہ صرف یہ تنبیہی اثر نہیں رکھے گا بلکہ اس کے شوق اور رغبت میں اضافہ بھی کر دے گا یعنی آپ اسے اس کے عمل میں آزاد چھوڑ دیں گے اور عملی طور پر اسے اس کے کام کا شوق اور رغبت دلائیں گے۔ ایسے موقعوں پر آپ کا یہ عمل درست نہیں ہوگا۔

پس علماء جو یہ کہتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک درجہ بے اعتنائی اور قطع تعلق ہے تو اس غرض سے کہ آپ کے عمل کا کچھ اثر ہو اور اثر بھی دوسرے کو متنبہ کرنا ہے۔ ایک اور قسم کا بھی اعراض اور ہجر ہوتا ہے جو نہی عن المنکر نہیں ہے بلکہ اس کی صورت دوسری ہے آپ کسی خاندان سے ملتے جلتے رہتے ہیں، اس سے دوستی کا اور کبھی کبھی رشتہ داری کا بھی تعلق رکھتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ خاندان بگڑ گیا ہے تو اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو بچانے کی خاطر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی بری عادت آپ کے خاندان میں سرایت کر جائے آپ اس خاندان سے قطع تعلق کر لیتے ہیں کیونکہ بیمار کے ساتھ رہنے سے بیماری لگ جاتی ہے۔

می روداز سینه هادرسینه ها ازره پنهاں صلاح وکینه ها

اور لوگ مخفی طور پر ایک دوسرے پر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ اس غرض سے کہ ان کی برعی عادت اپنے خانوادہ پر اثر انداز نہ ہو ان سے رابطہ منقطع کر لیتے ہیں لیکن اس موقع کی بات دوسرے موقعوں

سے جدا ہے۔

پس ایسے موقعوں پر جنہیں انسان خود ہی بہتر طور پہچان سکتا ہے، ان موقعوں پر جب انسان بری عادت میں پھنس گیا ہے اور آپ اس سے اپنی دوستی جاری رکھتے ہیں تو اسے برائی کی مزید رغبت ہوتی ہے اور اگر آپ اس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں تو اس کے ذہن پر چوٹ پڑتی ہے اور اسے تنبیہ ہو جاتی ہے، آپ پر بالکل واجب ہے کہ اس شخص سے ترک تعلق کر دیں اور اس سے سرد مہری برتیں، یہ ایک درجہ ہے۔

دوسرا مرحلہ: زبان سے روکنا

نہی عن المنکر کا دوسرا درجہ علماء اور دانشمندوں کے بیان کے مطابق زبان کا مرحلہ ہے۔ پند و نصیحت کا مرحلہ ہے یعنی اکثر ایسا بھی بیمار ہوتا جو منکر سے دوچار ہے اور برا کام کرتا ہے۔ اس کا سبب اس کی جہالت اور نادانی ہے۔ وہ ایک تبلیغ کا شکار ہے، اسے مربی کی ضرورت ہے، ہادی رہنما اور معلم کی ضرورت ہے ایک سمجھانے والے کی ضرورت ہے، ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس سے ملے جلے اس سے کمال مہربانی کرے تا کہ وہ واقف ہو اور پلٹ جائے۔ یہ مرحلہ بھی نہی عن المنکر کا ایک درجہ ہے اس کے سامنے کھول کھول کر بیان کرے تا کہ وہ واقف ہو اور پلٹ جائے۔ یہ مرحلہ بھی نہی عن المنکر کا ایک درجہ ہے اس لحاظ سے کہ ایسے معاملوں میں جن میں کوئی شخص ہم سے میل جول رکھتا ہے لیکن وہ ایک برے کام میں پھنسا ہوا ہے اور ہم واضح دلیل اور منطق سے اس کو اس عمل کے ترک کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں تو ہم پر واجب ہے کہ ہم اسی منطق کی مدد سے اس شخص سے تعلق قائم رکھیں۔

تیسرا مرحلہ: عمل کا مرحلہ

تیسرا مرحلہ عمل کا مرحلہ ہے، کبھی کبھی ایک شخص اس درجے اور اس حال میں ہوتا ہے کہ نہ ہمارا اعتراض اور لاتعلقی اس پر اثر کرتی ہے اور نہ ہم منطق، بیان اور سمجھانے بجھانے سے اس کو منکر سے روک سکتے ہیں تو ہم کو عمل کرنا چاہیے اگر ہم عمل کریں تو شاید کچھ کر سکتے ہیں۔ کس طرح عمل کریں؟ عمل کرنے کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں، عمل کرنے کے معنی صرف زور زور سے بولنا نہیں ہیں۔ ڈنڈے برسانا اور زخمی کرنا نہیں ہیں۔ بیشک میں یہ نہیں کہتا کہ عملی تنبیہ کبھی بھی نہیں ہونا چاہیے

۔ہاں! ایسے بھی مواقع ہوتے ہیں جب عملی تنبیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔اسلام ایسا دین ہے جو حد کا قائل ہے، سزا کا حامی ہے یعنی ایک ایسا دین ہے جس کا یہ اعتقاد ہے کہ ایسے مراحل اور مواقع بھی آجاتے ہیں جب مجرم پر عملی تنبیہ کے سوا کوئی دوسری تنبیہ اثر نہیں کرتی اور اسے برے کام سے نہیں روکتی انسان کو یہ سوچنے کی بھی غلطی نہیں کرنا چاہیے کہ تمام مواقع سختی اور سرد مہری کے ہی ہوتے ہیں۔

حضرت علیؑ پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں یوں بیان فرماتے ہیں:" **طبیب دوار بطبه قذ احکم مراهمه واحمی مواسمه**" وہ ایک طبیب تھے، ایسے طبیب تھے جو بیماروں اور بیماریوں کا علاج کرتے تھے۔پھر اطباء کے اعمال کو تشبیہ دیتے ہیں کہ اطباء بھی مرہم لگاتے ہیں اور جراحی بھی کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی داغ بھی دیتے ہیں۔آپؑ فرماتے ہیں کہ پیغمبرؐ دوہرا کام کرتے تھے: طبیب بھی تھے، مرہم لگانے والے بھی اور چیرا لگانے اور داغ دینے والے بھی۔مقصد یہ ہے کہ پیغمبرؐ دونوں کام کرتے تھے، پیغمبرؐ کا ایک کام شفقت اور مہربانی تھا۔پہلے" **احکم مراهمه**" کا ذکر فرماتے ہیں یعنی پیغمبرؐ کا پہلا کلام ہمیشہ لطف و مہربانی تھا آپ لطف و مہربانی سے علاج کرتے تھے۔منکرات اور خرابیوں کے خلاف لڑتے تھے اور اگر ایسا مرحلہ آجاتا تھا کہ لطف، مہربانی، احسان اور نیکی کا مزید فائدہ نہیں ہوتا تھا تو انہیں ان کے حال پر نہیں چھوڑتے تھے پھر یہ وقت ہوتا تھا کہ جب آپ جراحی اور داغ دینے اور جراحی کی نوبت آتی تو گہرا داغ لگا دیتے تھے اور قاطع جراحی کرتے تھے۔سعدی بھی ایسا ہی کہتے ہیں لیکن مہربانی کے حق کو مقدم مانے بغیر کہتے ہیں:

درشتی ونرمی بهم در به است چورگ زن که جراح ومرهم نه است

وہ کہتے ہیں کہ سختی بھی ہونا چاہیے اور نرمی بھی، جس طرح جراح جو نشتر بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی رکھتا ہے۔

امر بالمعروف نہی عن المنکر کی اقسام

اب امر بالمعروف کے بارے کیسے ہو؟ یہ کس شکل اور کس صورت سے انجام پاسکتا ہے؟ امر بالمعروف کی بھی بالکل یہی قسمیں ہیں بس اتنا سا فرق ہے کہ امر بالمعروف لفظی ہوتا ہے یا عملی۔لفظی امر بالمعروف اس طرح ہوتا ہے کہ انسان لوگوں سے حقائق بیان کرے، لوگوں کے سامنے خوبیوں کی تشریح کرے لوگوں کو شوق دلائے اور انہیں سمجھائے، آج نیک کام کون سا ہے؟ عملی امر بالمروف یہ ہے کہ انسان صرف یہ کہنے پر ہی قناعت نہ کرے، صرف کہنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ

ہمارے آج کے معاشرے کی ایک بیماری یہ ہے کہ ہم کہنے کی اہمیت اور قدر و قیمت کے ضرورت سے زیادہ قائل ہیں۔اس میں شک نہیں کہ کہنے کی بھی اہمیت ہوتی ہے میں کہنے کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا جب تک نہیں کہا جائے گا بات واضح نہیں کی جاسکے گی ،حقائق کی تحریر اور تشریح نہیں ہوسکتی کوئی کام نہیں ہوسکتا۔میں جو یہ کہتا ہوں کہ ہم زیادہ اہمیت کے قائل ہیں،اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہم ہر بات کو صرف گفتگو سے درست کرنا چاہتے ہیں۔ان لوگوں کی طرح جو ورد سے ہر شے کو درست کرنا چاہتے ہیں ،ورد کریں تو زمین آسمان اور آسمان زمین بن جائے ،ہم صرف لفظ اور بیان کی قوت سے کام کرنا چاہتے ہیں حالانکہ بات اس طرح نہیں بنتی۔

کہنا،ایک لازمی شرط تو ہے لیکن یہی کافی نہیں ہے،عمل بھی کرنا چاہیے۔لفظی امر بالمعروف اور عملی امر بالمعروف میں سے ہر ایک کی دو دو راہیں ہیں،ایک مستقیم اور دوسرا غیر مستقیم۔آپ جس وقت امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنا چاہتے ہیں براہ راست کرتے ہیں،آپ سیدھے سیدھے بات کہتے ہیں یعنی اگر آپ کسی کو کام کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہہ دیتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ کام کر دیں لیکن کسی وقت آپ اسے بالواسطہ بھی سمجھاتے ہیں جو زیادہ کارگر اور زیادہ مفید ہوتا ہے یعنی اس کے یہ سمجھے بغیر کے آپ کی گفتگو کا مخاطب اصلی وہی ہے آپ کسی ایسے شخص کی تعریف کرتے ہیں جس نے فلاں کام کیا ہے اس کام کی توجیہ اور تشریح کرتے ہیں کہتے ہیں فلاں شخص نے فلاں موقع پر ایسا عمل کیا ہے،یہ طریقہ برتا ہے وغیرہ وغیرہ تا کہ وہ جان لے اور سمجھ لے۔اس سے اس پر بہت اثر ہوتا ہے گویا عمل بالواسطہ طور پر بھی زیادہ موثر ہے۔اب میں بالواسطہ طریقے کے متعلق آپ کے سامنے ایک مشہور حدیث بیان کرتا ہوں دیکھئے یہ طریقہ کتنا موثر اور کارگر ہے:

حضرات حسنینؑ (امام حسنؑ اور امام حسینؑ) جب دونوں بچپنے میں تھے ایک بوڑھے شخص سے ملتے ہیں جو وضو کر رہا تھا انہیں معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کا وضو باطل ہے۔یہ دونوں صاحب زادے اسلام کے رواج اور نفسیات کے اصولوں سے واقف تھے۔فوراً آمادہ ہوگئے کہ ایک طرف تو بوڑھے کو بتادیں کہ تیرا وضو باطل ہے لیکن دوسری طرف اگر اس سے براہ راست کہتے ہیں کہ جناب آپ کا وضو باطل ہے تو اس کی شخصیت مجروح ہوجائے گی اور وہ ناراض ہوجائے گا۔اس کا پہلا ردعمل یہ ہوتا کہ وہ کہتا نہیں !اسی طرح درست ہے، چاہے جو کچھ بھی کہیں وہ اس پر کان نہیں دھرتا۔اس لئے دونوں ان کے سامنے

گئے اور کہنے لگے: ہم دونوں آپ کے سامنے وضو کرنا چاہتے ہیں۔ آپ یہ دیکھئے کہ ہم میں سے کون بہتر وضو کرتا ہے (عملاً بوڑھا آدمی بچوں کی بات مان لیتا ہے) وہ کہتا ہے وضو کرو تا کہ میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں۔ امام حسنؑ نے ان کے سامنے پورا وضو کیا، ان کے بعد امام حسینؑ نے بھی کیا۔ آخر میں بوڑھے کو خیال آیا کہ خود اس کا وضو درست نہیں تھا، وہ بعد میں کہنے لگا آپ دونوں کا وضو درست ہے، میرا ہی وضو غلط تھا۔ اس طرح وہ اس شخص سے منوا لیتے ہیں۔ اب اگر اس وقت فوراً کہہ دیتے بوڑھے! تجھے شرم نہیں آتی اس سفید داڑھی پر بھی تجھے وضو کرنا نہیں آتا؟ خدا تجھے موت دے۔ تو وہ نماز پڑھنا بھی چھوڑ دیتا۔ ایک خطیب بیان کرتے تھے کہ مشہد میں ایک شخص دین سے قطعی کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ نہ صرف نماز ہی پڑھتا تھا اور روزہ بلکہ کسی بات پر ایمان نہیں رکھتا تھا، دین کا مخالف شخص تھا۔ وہ کہتے تھے کہ کافی دن تک اس آدمی کے ساتھ رہے یہاں تک کہ وہ نرم و ملائم اور واقعی خوش اعتقاد اور مومن بن گیا اور اس نے اپنا طور و طریقہ بالکل بدل دیا وہ نماز پڑھتا تھا، روزہ رکھتا تھا اور پھر یہاں تک ہوا کہ باوجود یکہ افسر تھا اور خراسان میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا آگے چل کر نماز باجماعت پڑھنے کا پابند ہو گیا تھا۔ مسجد گوہر شاد جاتا تھا مرحوم آقائے نہاوندی کے پیچھے اس شکل سے کہ لباس پہنتا تھا اس پر عبا بھی پہنتا تھا، ہمارے جلسوں میں شریک ہوتا تھا، ایک مدت کے بعد ہم نے دیکھا کہ وہ شخص غائب ہو گیا، ہم نے کہا یقیناً سفر پر چلا گیا ہے۔ اس کے ساتھیوں نے کہا نہیں یہیں ہے لیکن آتا نہیں ہے۔ اب کیا ہو گیا جو ہمارے جلسوں میں شرکت نہیں کرتا، ہم نہیں جانتے؟ اس کے بعد معلوم ہوا کہ نماز جماعت میں بھی نہیں جاتا۔ ہم نے چھان بین کی کہ دیکھیں کیا سبب ہے؟ یہ شخص جو دین اور مذہب میں یوں داخل ہوا تھا یکا یک دین و مذہب سے کیسے پھر گیا؟ ہم اس کی تلاش میں گئے تو معلوم ہوا کہ بات کچھ یوں ہوئی ہے یہ صاحب کچھ دن لگاتار نماز جماعت میں جا کر چوتھی یا پانچویں صف میں کھڑے ہو جاتے تھے، ایک دن مقدس نماؤں میں سے ایک جو امام کے پیچھے پہلی صف میں بیٹھے تھے لوگوں کے درمیان پہلی صف میں اپنی نماز کی جگہ سے اٹھتے ہیں، اس شخص کو تلاش کرتے آتے ہیں، اس کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں کہتے ہیں: جناب! وہ کہتا ہے: جی! میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں، فرمائیے! آپ مسلمان ہیں یا نہیں؟ یہ بیچارہ سٹپٹا گیا کہ کیا جواب دے۔ وہ کہتا ہے یہ کیا سوال ہے جو آپ مجھ سے کر رہے ہیں؟ وہ کہتا ہے نہیں میں چاہتا ہوں کہ آپ فرمائیے کہ آپ مسلمان ہیں یا مسلمان نہیں ہیں؟ یہ بدنصیب

ناراض ہوجاتا ہے اور کہتا ہے میں مسلمان ہوں، اگر مسلمان نہ ہوتا تو مسجد گوہر شاد میں جماعت کی صف میں کیوں آتا؟ وہ کہتا ہے کہ آپ مسلمان ہیں تو آپنے اپنی داڑھی ایسی کیوں رکھی ہے؟ وہ اسی وقت جانماز اٹھاتا ہے اور کہتا ہے یہ مسجد، یہ نماز جماعت اور یہ دین و مذہب تمہارا۔ یہ جا اور وہ جا؟ نہی عن المنکر کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے یعنی لوگوں کو دین سے بھگانہ اور بیزار کرنا، مخالف بنانے، دشمن بنانے کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی اور بات نہیں ہوسکتی۔

کسی وقت میں نے ایک رسالے میں بیرون ملک کا ایک قصہ پڑھا تھا۔ لکھا تھا کہ ایک لڑکی بہت مذہبی تھی۔ ایک شہزادہ اس لڑکی پر بہت عاشق تھا لیکن وہ عیاش شخص تھا اور چاہتا تھا کہ اسے کسی طرح اپنے جال میں پھنسالے اور یہ لڑکی اپنی پاکدامنی اور راستبازی کے باعث اس کے قابو میں نہیں آتی تھی۔ شہزادے نے ہر چال چلی جس سے اسے فریب دے سکے لیکن کارگر نہیں ہوئی۔ آخر کار وہ قریب قریب ناامید ہوگیا، بات آئی گئی ہوگئی۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک شخص اس لڑکی کا پیغام لایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ اس بات پر آمادہ تھی کہ ساتھ ساتھ رہیں اور کچھ عرصے تک عیش کریں۔ شہزادے کو تعجب ہوا تو اس نے اس کی تحقیق کی اس کو معلوم ہوا کہ ہاں لڑکی آمادہ ہے۔ اس شہزادے نے اس واقعہ کے سلسلے میں چھان بین کی کہ ایک لڑکی جو اس قدر پاکدامن اور شریف تھی یکا یک عیاشی اور فسق و فجور پر کیسے مائل ہوگئی، تو معلوم ہوا کہ بات کچھ یوں ہوئی تھی کہ ایک پادری کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکی مذہبی رجحان رکھتی ہے اپنے نزدیک اسے زیادہ مذہبی بنانے کی غرض سے ایک دن اس لڑکی سے وقت لیتا اور اس کے پاس آتا ہے وہ کہتا ہے میں تیرے لئے ایک تحفہ لایا ہوں مثلاً ایک برتن پر تولیہ ڈھانک دیتا ہے تحفہ لاکر اس کے سامنے رکھ دیتا ہے اور تولیہ اٹھا کر تحفہ دکھاتا ہے، ایک بار لڑکی دیکھتی ہے کہ وہ قبرستان سے کسی مردے کی کھوپڑی لے آیا ہے، جیسے ہی اس پر لڑکی کی نگاہ پڑتی ہے وہ ہل جاتی ہے، پوچھتی ہے یہ کیا ہے؟ وہ کہتا ہے میں یہ اس لئے لایا ہوں کہ تم اس کے بارے میں سوچ بچار کرو اور دیکھو کہ دنیا کس قدر بے وفا ہے۔ اس نے اس لڑکی کے دل میں اس قدر نفرت پیدا کردی کہ نہ صرف اس کے وعظ کا اثر نہیں ہوا بلکہ اس وقت سے وہ یہ سوچنے لگی کہ میں اس کے خلاف عمل کروں گی، دنیا کا تو یہ انجام ہے۔ میں اپنی زندگی کے یہ چار دن اس طریقے سے کیوں گذاردوں؟ چنانچہ وعیاشی کی طرف مائل ہوگئی۔

نصیحت کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے، یقین کیجئے کہ بہت سے لوگ جو پند ونصیحت کرتے ہیں ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو صورت بنتی ہے وہ بیشتر ایسے ہی منکرات کی ہوتی ہے۔خود میرا بھی ایک قصہ ہے۔میں جن دنوں قم میں تھا مسافر بری (ٹرانسپورٹ) کمپنیاں نئی چلی تھیں ہم آئے اور مشہد کے لئے سوار ہو گئے۔بڑی دیر کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس بس کا ڈرائیور میری ذات سے اس لئے بغض ونفرت رکھتا ہے۔کہ میرے سر پر عمامہ ہے، نہ میں اسے جانتا تھا، نہ ہمارا کوئی ذاتی تعلق تھا۔ورامین میں جب وہ رکا تو میں نے اس سے پوچھنا چاہا کہ تم یہاں کتنی دیر ٹھہرو گے اس نے مجھے اس سختی سے جھڑکا کہ پھر مشہد تک میری ہمت نہیں پڑی کہ میں اس سے کوئی بات بھی کرتا۔مین نے خود ہی اس کی وجہ سمجھنے کی کوشش کی، میں نے دل میں کہا کہ یہ شخص کم سے کم مسلمان نہیں ہے مادی، یہودی، جو بھی ہو میں نے خود فیصلہ کر دیا کہ ایسا ہی ہے۔مجھے یاد ہے کہ جب ہم سمنان کے قریب پہنچے ہیں تو ظہر کا وقت گزر چکا تھا۔میں جس وقت وضو کرنے گیا کہ نماز پڑھوں میں نے اسی ڈرائیور کو دیکھا کہ وہ اپنے پاؤں دھو رہا ہے میں اس پر نظر رکھے رہا، میں نے دیکھا کہ پاؤں دھو کر اس نے وضو کیا پھر نماز پڑھی، مجھے حیرت ہوئی، یہ مسلمان اور نمازی ہے لیکن میرے ساتھ اس کا طرز عمل جیسا تھا ویسا ہی رہا۔رات ہو گئی میرے پیچھے (خراسان) تربت کے دو طالب علم تھے، وہ بھی تعطیلات میں خراسان (تربت) جانا چاہتے تھے۔وہ (ڈرائیور) مجھ سے جتنی نفرت اور بے رخی کا اظہار کر رہا تھا ان لوگوں پر اتنا ہی مہربان تھا۔انہیں پسند کرتا تھا۔رات کو جب مسافر عموماً سو جاتے ہیں اس نے ان میں سے ایک کو اپنے پاس بلا لیا کہ بات چیت کریں تا کہ نیند نہ آئے وہ چلا گیا۔جس وقت سب سو رہے تھے ایک دم میرے کان کھڑے ہوئے میں نے دیکھا کہ یہ ڈرائیور ایک طالب علم کو اپنا حال سنا رہا ہے میں نے کوشش کر کے کان لگائے تا کہ میں بھی سن سکوں، پہلے تو اس نے مشہد کے لوگوں کے بارے میں بتایا کہ جو لوگ ملاؤں سے تعلقات رکھتے ہیں وہ مجھے برے لگتے ہیں، صرف وہ لوگ جو ثروت مند ہوتے ہیں مجھے اچھے لگتے ہیں۔وہ بولا مختصر طور پر یہ سمجھو کہ میرے پورے خاندان میں ایک میں ہی ڈرائیور ہوں ورنہ دوسرے ڈاکٹر ہیں، انجینئر ہیں، تاجر ہیں، افسر ہیں۔خاندان بھر میں کم نصیب میں ہی ہوں۔اس نے پوچھا: اس کا سبب کیا ہے؟ وہ بولا: میرا قصہ یہ ہے کہ:

میرے والد مسلمان اور بہت دیندار شخص تھے۔میں بچہ تھا، مجھے انہوں نے اسکول میں داخل

کروایا۔میرے محلے کے پیش نماز کو اس بات کی اطلاع ہوگئی تو میرے والد کے پاس آیا اور کہنے لگا: آپ نے اپنے بچے کو اسکول بھیج دیا ہے؟انہوں نے جواب دیا ہاں!وہ بولا افسوس۔کیا آپ نہیں جانتے کہ اگر آپ کا بچہ اسکول جائے گا تو لامذہب ہوجائے گا؟ میرے والد بھی بالکل ان پڑھ تھے ۔انہوں نے اس بات پر یقین کرلیا، میں بھی بچہ تھا،اس کے بعد میرے والد نے مجھے سبق پڑھنے نہیں جانے دیا، دوسرے کاموں میں لگا دیا۔جب میں بال بچوں والا ہوگیا تو ایک دن مجھے خیال آیا کہ میں تو بالکل ان پڑھ ہوں، اب یہ معما مجھ پر کھلا کہ یہ بیچارہ ایک طرف خود مسلمان تو ہے لیکن اپنے آپ کو میری طرح بدنصیب شمار کرتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ یہی عمامہ باندھنے والے ہیں جنہوں نے مجھے بدبخت رکھا، یہ نہی عن المنکر کی ایک قسم ہے یعنی بھگانا،لوگوں کو بدبخت رکھنا اور دین اور روحانیت کا دشمن بنانا۔پھر میں نے دل میں کہا کہ خدا اس کے باپ کو بخشے یہ صرف ملاؤں ہی کا دشمن ہے اسلام کا دشمن نہیں ہوا،نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے امام رضاؑ کی زیارت کو جاتا ہے۔یہ بالواسطہ طور پر اسلام کو نقصان پہنچانے والا عمل ہے۔

آپ کو ایک اور قصہ سناتا ہوں۔ایک طالب علم بہت قابل محترم تھا، بہت روشن خیال اور دیندار تھا۔یہ شخص پہلی بار ہیٹ لگا کر مجمع میں جاتا ہے تو اس کے تمام دوست اور رفیق جو اسے دیکھتے ہیں اس پر حملہ کرتے اور اس کی توہین کرنے لگتے ہیں۔اسے اس قدر ناراض اور مشتعل کردیتے ہیں کہ وہ اپنی طبعی بردباری کے باوجود پلٹ کر ان سے ایک بہت منطقی بات کہتا ہے، وہ کہتا ہے اے میرے دوستو! مجھے تم سے ایک بات کہنا ہے۔پھر وہ کہتا ہے تم اپنے دشمنوں کے دوست اور دوستوں کے دشمن ہو، میں تمہارے سامنے اس کی وضاحت کرتا ہوں: میں تم ہی جیسا ایک شخص ہوں، تمہاری ہی طرح تعلیم پائی ہے تمہاری ہی طرح خدا، قرآن، پیغمبرؐ اور آئمہؑ، میں نے تمہاری طرح تعلیم پائی ہے اور تمہاری ہی طرح میری تربیت ہوئی ہے۔میرے اور تمہارے درمیان دس ہزار باتیں مشترک ہیں تمہارے کہنے کے مطابق اگر یہ گناہ ہے تو میں نے زیادہ سے زیادہ ایک گناہ کیا ہے۔فی الحال میں نے اپنا لباس کسی کام، کسی پیشے، کسی مصرف کے لئے تبدیل کرلیا ہے، میں فرض کئے لیتا ہوں کہ یہ گناہ ہے۔تم میرے ساتھ ایسا سلوک کر کے مجھے مجبور کرو گے کہ میں تم سے تعلق ختم کرلوں اور چونکہ کوئی انسان بے تعلق نہیں رہ سکتا اس لئے میں مجبور ہو جاؤں گا کہ اس وقت کے بعد تمہارے مخالفوں اور دشمنوں کا دوست بن

جاؤں چونکہ تم مجھے زبردستی اپنے پاس سے دور کرنا چاہتے ہو اس لئے تم اپنی اس دلیل کی رو سے اپنے دوست کے یعنی میرے دشمن ہو اور اپنے دشمنوں کے دوست ہو۔

پھر وہ مثال پیش کرتا ہے: وہ کہتا ہے کہ فلاں شخص نے اپنی عمر بھر میں کسی وقت بھی اسلام سے ظاہر داری بھی نہیں برتی، اس میں اسلام کی کوئی علامت نہیں رہی، نہ اس نے کبھی قرآن پر اعتقاد کا اظہار کیا نہ اسلام پر، یہ بھی مشہور ہے کہ وہ ظالم، فاسق اور شرابی ہے اس شخص سے آپ کو کوئی امید نہیں ہے۔ یکا یک آپ دیکھتے ہیں کہ وہ حضرت امام رضاؑ کی زیارت کو آیا ہے، آپ سب کہہ اٹھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ آدمی مسلمان ہے۔ اس بار جب آپ اسے دیکھتے ہیں تو اس سے اچھی طرح ملتے ہیں یعنی اس کی ہزار عادتوں میں سے نوسو ننانوے آپ کے اور آپ کے دین کے خلاف ہیں چونکہ آپ کو اس سے کوئی امید نہیں ہے صرف اس بنا پر کہ وہ حضرت امام رضاؑ کی زیارت کو آ گیا ہے آپ کہتے ہیں: نہیں! معلوم ہوا خصلت آپ کے قول کے خلاف ہے اس ایک خصلت کی وجہ سے آپ کہتے ہیں کہ یہ مسلمان نہیں ہے۔ یہ دوسرا اسلام کے دائرے سے خارج ہو گیا۔ پس آپ اپنے دشمنوں کے دوست ہیں یعنی اپنے دشمنوں کی مدد کرتے ہیں اور دوستوں کے دشمن ہیں یعنی واقعی آپ اپنے دشمن ہیں۔

اگر آپ بالواسطہ طور پر امر بالمعروف کرنا چاہیں تو اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ خود نیک اور پرہیزگار ہوں، خود اہل عمل اور اہل تقویٰ ہوں۔ جب آپ خود ایسے ہوں گے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مجسمہ بن جائیں گے۔ انسان پر عمل سے زیادہ کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ انبیاء اور اولیاء کی زیادہ پیروی کرتے ہیں اور دانشمندوں اور فلسفیوں کی اتنی پیروی نہیں کرتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ فلسفی صرف باتیں کرتے ہیں، صرف پڑھاتے ہیں، صرف نظریہ پیش کرتے ہیں لیکن اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں کتاب لکھتے ہیں اور لوگوں کو دے دیتے ہیں اور انبیاء اور اولیاء صرف نظریہ اور خیال ہی نہیں رکھتے عمل بھی رکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں پہلے اس پر عمل کرتے ہیں، یہ بھی نہیں ہوتا کہ پہلے کہیں پھر عمل کریں بلکہ پہلے عمل کرتے ہیں پھر کہتے ہیں۔ جس وقت انسان نے عمل کرنے کے بعد کچھ کہا تو اس کے کہے ہوئے کا اثر کئی گناہ زیادہ ہو جاتا ہے۔

حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ فرماتے ہیں (اور تاریخ بھی گواہی دیتی ہے کہ ایسا ہی ہے): "**ما امرتکم بشیء الا وقد سبقتکم بالعمل به و لا نهیتکم عن شیء الا وقد سبقتکم بالنهی**

عنہ" تم نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ میں نے خود عمل کرنے سے پہلے تمہیں کسی بات کا حکم دیا ہو، جب تک میں پہلے خود عمل نہیں کر لیتا تم سے نہیں کہتا اور میں تمہیں کسی بات سے اس وقت تک منع نہیں کرتا جب تک پہلے میں نے اسے ترک نہ کر دیا ہو چونکہ میں خود نہیں کرتا اس لئے تمہیں بھی منع کرتا ہوں۔ "کونو دعاۃ للناس بغیر السنتکم "لوگوں کو دین کی طرف بلاؤ لیکن زبان سے نہیں غیر زبان سے بلاؤ یعنی اپنے عمل سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو! جس وقت انسان خود عمل کرتا ہے تو اس کا عمل اپنے آپ جامعہ پر اپنا اثر ڈالنے لگتا ہے۔ مشہور فلسفی جان پال سارٹر کا قول ہے، گویا اس کے قول میں کوئی ندرت نہیں ہے لیکن اس کی اس تشریح میں نیا پن ہے جو وہ کرتا ہے، وہ کہتا ہے میں جو کام کرتا ہوں ایک طرح سے میں اپنے جامعہ کو اس سے وابستہ کر دیتا ہوں اور یہ بات سچ بھی ہے، آپ اچھا یا برا جو کام کرتے ہیں اپنے جامعہ کو اس کام سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ لامحالہ آپ کا کام ایک لہر پیدا کر دیتا ہے، جامعہ کے لئے بھی یعنی ہر کام ایک طرح سے معاشرے کے لئے ایک حکم ہوتا ہے کہ تو بھی ایسا کر! جس وقت میں کوئی کام کرتا ہوں تو میرے عمل کی زبان یہ ہوتی ہے کہ دوست! تو بھی میری ہی طرح ہو جا! میں خواہ کتنا ہی کہوں کہ میری طرح نہ بنو ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں چاہے جتنا آپ سے کہوں کہ میرے کہے پر عمل کیجئے لیکن میرے کردار یعنی عمل سے تعلق یا سروکار نہ رکھئے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ سے یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ میرے قول پر دھیان دیں اور میرے کردار پر توجہ نہ کریں۔ آپ کے لئے جو ذمہ داری پیدا کرنے والی چیز ہے وہ پہلے نمبر پر میرا عمل ہے دوسرے نمبر پر میرا قول ہے۔

ہر اصلاح کرنے والے کو پہلے نیک ہونا چاہیے تا کہ وہ اصلاح کر سکے، وہ آگے آگے چلے اور دوسروں سے کہے کہ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ ان دو شخصوں میں بہت فرق ہے جن میں سے ایک کھڑا ہوا ہے اور اپنے سپاہی کو حکم دیتا ہے کہ آگے بڑھ میں یہاں کھڑا ہوا ہوں اور دوسرا جو خود آگے آگے چلتا ہے اور کہتا ہے میں چلا، تم بھی میرے پیچھے پیچھے آؤ!

انبیاء اور اولیاء کے مکتب میں ہم ان لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ یہ ہمیشہ کہتے ہیں: "ہم چلے" حضرت علیؑ کہتے ہیں میں پہلے چلتا ہوں بعد میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ میرے پیچھے پیچھے آؤ!

پیغمبر اکرمؐ جس بات کا حکم دیتے تھے اگر پہلے اس میں خود قدم نہ بڑھاتے تو دوسروں کا پیروی کرنا ناممکن تھا، جب وہ نماز اور نماز شب کی بات کرتے تھے تو خود دوسروں سے زیادہ عبادت کرتے

تھے {إِنَّ رَبَّکَ یَعْلَمُ أَنَّکَ تَقُومُ أَدْنَی مِنْ ثُلُثَیِ اللَّیْلِ} (آپ کا پروردگار جانتا ہے کہ آپ ایک تہائی رات (تہجد کے لیے) کھڑے رہتے ہیں) (مزمل:۲۰)

اگر خدا کی راہ میں خیرات اور ایثار کے کہتے تھے تو سب سے پہلے ایثار اور انفاق کرنے والے خود ہی تو تھے یعنی سب سے پہلے اپنے آپ سے وصول کرتے تھے اور دوسروں کو دیتے تھے، اگر کہتے تھے جہاد فی سبیل اللہ تو لڑائیوں میں خود آگے چلتے تھے، اپنے عزیزوں کو آگے لے جاتے تھے اور پھر دوسرے لا محالہ محبت کرنے لگتے تھے، عاشق ہو جاتے تھے کہ یہ شخص اپنے مقصد کی راہ میں اپنے سب سے زیادہ پیارے رشتہ داروں کو موت کے منہ میں بھیج دیتا ہے، سب سے پہلے خود ہتھیار لگا کر دشمن کی فوج میں گھس پڑتا ہے، خود وار سہتا ہے، اپنا دانت تڑوالیتا ہے، اپنی پیشانی زخمی کروالیتا ہے۔ اس وقت وہ لوگ ایسے شخص کی ذات میں حقیقت کا نظارہ کرتے تھے۔

پیغمبر اکرمؐ کو حضرت علیؑ سے زیادہ کون پیارا تھا؟ سید الشہداء حضرت حمزہ سے زیادہ عزیز کون تھا؟ آپؐ نے جنگ بدر میں سب سے پہلے کن لوگوں کو میدان میں بھیجا؟ حضرت علیؑ کو بھیجا جو آپ کے داماد اور چچیرے بھائی تھے اور چونکہ حضرت علیؑ بچپن سے پیغمبرؐ کے گھر میں پلے بڑھے تھے اور پیغمبرؐ کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لئے حضرت علیؑ حقیقت میں پیغمبرؐ کے بیٹے کی جگہ تھے۔ آپؐ نے اپنے چچا حضرت حمزہ کو بھیجا جن کی آپ بہت عزت کرتے تھے، اپنے چچیرے بھائی جناب ابوعبیدہ بن الحارث کو بھیجا جو آپ کو بہت عزیز تھے۔

امام حسینؑ نے کتنا خطاب کئے اور کتنا عمل کیا ان کے خطبات کتنے کم اور ان کے اعمال کتنے زیادہ تھے۔ جب عمل کا وقت ہوتا ہے تو گفتگو کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی۔ امام حسینؑ اپنی تقریر میں فریاد کرتے ہیں:

"فمن کان باذلا فینا مهجته، موطنا علی لقاء الله نفسه فلیر حل معنا فانی راحل مصبحاً انشاء الله "جو شخص اپنا خون دل ہماری خاطر بخشش کرنا چاہتا ہے اور جس نے خدا کی ملاقات کا ارادہ کرلیا ہے ایسا شخص ہمارے ساتھ سفر کرسکتا ہے (وہ واپس چلا جائے جو ملک کی ہوس میں آیا ہے) جو جان دینے پر آمادہ نہیں ہے وہ ہمارے ساتھ نہ آئے۔ ہمارا قافلہ جانبازوں (جان دینے والوں) کا قافلہ ہے ان جان سے جانے والوں میں سب سے محترم ہستی امام حسینؑ کی ہے۔ اگر امام حسینؑ اپنے

عزیزوں کو مدینہ میں چھوڑ دیتے تو کیا کوئی ان پر اعتراض کرسکتا تھا؟ ہرگز نہیں! لیکن وہ اپنے عزیزوں کو کربلا کے منظر میں نہ لاتے اور خود اکیلے شہید ہوجاتے تو کیا جو منزلت انہیں آج حاصل ہوئی وہ حاصل ہو جاتی؟ ہرگز نہیں! امام حسینؑ نے وہ کام کیا جو خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے یعنی اپنے عمل کو انتہائی بلندی پر پہنچا دیتا یعنی کوئی چیز نہیں چھوڑی جو خدا کی خاطر نہ لٹا دی ہو۔ ان کے رشتہ دار بھی ایسے لوگ نہیں تھے، جنہیں امام حسینؑ زبردستی لائے ہوں، وہ ان کا سا عقیدہ، ان کا سا ایمان اور انہیں کی سی سوچ بچار رکھتے تھے۔ بنیادی طور پر امام حسینؑ ایسے شخص نہیں تھے جن کے وجود میں یا جن کے ہمراہ ذرا سی بھی کمزوری ہوتی، اس لئے انہوں نے راہ میں دو تین بار چھان پھٹک کی۔ اس سے پہلے دن جب مکہ سے سفر کرتے ہیں اعلان کر دیتے ہیں کہ جو جانباز نہ ہو وہ نہ آئے لیکن بعض لوگ ابھی تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید امام حسینؑ کے جانے کی کوفہ کو خبر ہوجائے اور وہاں آپ کا خیر مقدم ہوجائے، پذیرائی ہوجائے ہم پیچھے نہیں رہتے، امامؑ کے ساتھ ہی چلتے ہیں، ساتھ آتے ہیں راستے میں کچھ عرب صحرانشین بھی امام حسینؑ کے ساتھ ہوجاتے ہیں۔

امامؑ راستے میں تقریر کرتے ہیں۔ اے لوگو! جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہم کوئی مقام حاصل کر رہے ہیں، کسی مقام و منصب تک پہنچ رہے ہیں، ایسا نہیں ہے وہ واپس چلا جائے چنانچہ کچھ لوگ واپس بھی چلے گئے، آپ نے آخری چھان پھٹک شب عاشور کی شب کی لیکن عاشور کی رات کوئی نہ گیا، صرف "ناسخ التواریخ" کے مصنف نے یہ تاریخی غلطی کی ہے اور لکھا ہے کہ جس وقت امام حسینؑ نے عاشور کی رات کو اپنے اصحاب سے بات چیت کی تو ان میں سے کچھ لوگ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر چلے گئے حالانکہ کوئی تاریخ اس امر کی تائید نہیں کرتی۔ یہ صرف "ناسخ التواریخ" کے مصنف کی غلطی ہے اور کسی شخص کو اس قسم کا مغالطہ نہیں ہوا ہے۔ عاشور کی رات کو امام حسینؑ کے اصحاب میں سے کوئی شخص بھی نہیں گیا بلکہ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم میں کوئی کھوٹ یا کمزوری رکھنے والا شخص موجود نہیں ہے۔

اگر عاشور کے دن امام حسینؑ کا کوئی ایک صحابی یہاں تک کہ بچہ بھی کمزوری دکھا دیتا، دشمن کے لشکر میں جو زیادہ قوی اور طاقتور تھا جا ملتا اور اپنے آپ کو خطرے سے بچا کر دشمنوں کی پناہ میں چلا جاتا تو امام حسینؑ اور ان کے مکتب کا ایک نقص ہوتا بلکہ اس کے برعکس خود دشمن امام حسینؑ کی طرف آ گئے۔ یہ اپنے ان دشمنوں کو اپنی طرف لے آئے جو مأمون اور محفوظ تھے اور انہیں خطرے کی جگہ اور مرکز میں

لا بٹھایا یعنی وہ لوگ خود ہی آ گئے لیکن ان میں سے ایک بھی خطرے کے اس مقام سے اس محفوظ مقام کی طرف نہیں گیا۔ اگر امام حسینؑ نے پہلے سے وہ چھان پھٹک اور خطرے کا اعلان نہ کیا ہوتا تو ایسے بہت سے حادثے پیش آ جاتے، آپ کسی وقت دیکھتے کہ آدھی جماعت چلی گئی اور پھر وہ نعوذ باللہ امام حسینؑ کے خلاف پروپیگنڈا کرتی کیونکہ جو کوئی چلا جاتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ میرا ایمان کمزور ہے یا میں ڈرتا تھا بلکہ اپنے عمل کی کوئی نہ کوئی توجیہ تلاش کر لیتا ہے، جھوٹ بولتا ہے اور پھر دعویٰ کرنے لگتا ہے کہ ہماری تشخیص کے مطابق راہ حق یہی ہے، خدا کی خوشنودی اس میں ہے، ہم یہی کام کر رہے تھے، ہم نے تحقیق کر لیا تھا کہ حق اسی طرف ہے، وہ مجبوراً اپنے حق میں منطق اور دلیل تیار کرتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا اور یہ بھی ایک بہت بڑا افتخار امام حسینؑ اور حسینی مکتب کا ہے کہ حریف کے ایک بزرگ ترین سردار کو اپنی طرف لے آئے ایسا شخص جو بنیادی طور پر امیر کے منصب کے لئے نامزد تھا جناب حر بن یزید ریاحی وہ کوئی چھوٹے موٹے آدمی نہیں تھے اگر حساب لگاتے تو عمر ابن سعد کے بعد اس لشکر کی دوسری شخصیت کون سی ہے؟ جناب حر بن یزید ریاحی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، یہ ایک بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ اس کے علاوہ پہلے شخص تھے جو ایک ہزار سواروں کے ساتھ اس کام پر تعینات کئے گئے تھے۔ لیکن امام حسینؑ کی قوت جاذبہ، ایمان، عمل اور عملی امر بالمعروف نے جناب حر بن یزید کو جس نے پہلے امامؑ کے سامنے تلوار کھینچی تھی اطاعت پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے توبہ کی "التائبون" کا جزو بن گئے {**التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناهون عن المنکر**}

جو شخص بہادری اور جوانمردی میں معروف تھا اور جس کا بہترین ثبوت یہ تھا کہ اسے ہزار سوار دیئے گئے تھے تا کہ امام حسینؑ کی راہ روکے اور جو ایک نامور شجاع ہے امام حسینؑ اس کے دل میں اس طرح ابھرے ہیں کہ جس طرح سماور کے اندر جو آگ ہوتی ہے اور اسے جوش میں لاتی ہے، بھاپ کا دباؤ بڑھتا ہے اور سماور کو ہلا دیتی ہے، لرزا دیتی ہے، حقیقت کی وہ آگ جو امام حسینؑ نے اس شخص کے دل میں روشن کی تھی اس کی ہستی کی دیواروں کے سامنے (وہ بھی ہماری آپ کی طرح دنیا کا طالب تھا، پیسہ اور منصب اور سلامتی چاہتا تھا، امن وسکون چاہتا تھا) اس پر دباؤ ڈال کر کہتی ہے امام حسینؑ کی طرف جا لیکن دوسری جانب میں چلا جاؤں تو ایک گھڑی بعد ہی قتل ہو جاؤں گا پھر بیوی بچوں کو نہیں دیکھ پاؤں گا تمام دولت میرے ہاتھ سے نکل جائے گی شاید میرے بعد دشمن میری تمام دولت ضبط کر لے گا

میرے بچے سرپرست کے بغیر رہ جائیں گے میری بیوی بیوہ ہوجائے گی۔ یہ خیالات اسے امامؑ کی طرف جانے سے روکتے ہیں، وہ ان دو مخالف قوتوں کے دباؤ میں آجاتا ہے، ایک وقت لوگ اس پر نظر ڈالتے ہیں دیکھتے ہیں کہ جناب حر کانپ رہے ہیں کسی نے اس سے پوچھا: کیوں کانپتے ہو؟ آپ تو بہادر آدمی تھے انہوں نے یہ سمجھا کہ وہ میدان جنگ کے ڈر سے کانپ رہے ہیں۔ انہوں نے جواب نہیں دیا: نہیں، تو نہیں جانتا کہ میں ضمیر کے کس عذاب میں مبتلا ہوں، میں اپنے آپ کو جہنم اور جنت کے درمیان بااختیار پاتا ہوں، میں نہیں سمجھتا کہ بہشت کو ادھار پر لے لوں یا اسی نقد دنیا کے پیچھے جاؤں جس کا انجام جہنم ہے۔ دیر تک اپنے آپ سے لڑتا ہوا کشمکش میں مبتلا رہا لیکن آخر میں اس شریف آدمی اور بقول امام حسینؑ حر اور آزاد شخص نے فیصلہ کرلیا۔ اس وجہ سے کہ دشمن نہ اسے روکے آہستہ آہستہ ایک طرف ہٹتے گئے پھر یکا یک انہوں نے اپنے گھوڑے کو ایڑھ لگایا اور حسینی خیموں کی طرف چلے گئے لیکن اس خیال سے کہ کہیں مولا یہ نہ سوچیں کہ حملے کے ارادے سے آرہا ہوں انہوں نے امان کی نشانی دکھائی۔

لکھا ہے "**قلب ترسہ**" یعنی انہوں نے اپنی ڈھال الٹ دی اس علامت کے طور پر کہ میں لڑنے نہیں آیا ہوں، امان چاہتا ہوں۔ جو شخص سب سے پہلے اس کے سامنے آیا وہ امام حسینؑ تھے چونکہ امامؑ حرم کے خیموں کے باہر کھڑے ہوئے تھے جناب حر نے سلام کیا: **السلام علیک ایاابا عبداللہ** !عرض کیا اے آقا! میں گنہگار ہوں، روسیاہ ہوں، مین وہی گنہگار اور مجرم ہوں (وہی پہلا شخص ہوں) جس نے آپ کا راستہ روکا تھا، اپنے خدا کی قسم کھا کر عرض کرتا ہوں: اے خدا اس گنہگار کو گناہ معاف کردے" **اللھم الیک تبت فتب علی فقد ارعبت قلوب اولیائک**" (اے خدا میں نے تیرے ولیوں کے دل لرزائے ہیں) میں نے انہیں ڈرایا (جس وقت امام حسینؑ کے اہل بیت نے انہیں راستے میں دیکھا تھا وہ پہلے موقع تھا جب ان کی نظر دشمن پر پڑی تھی۔ جس وقت ایک ہزار مسلح سپاہی اپنے سامنے کھڑے ہوئے دیکھتے ہیں تو لامحالہ ان پر خوف اور ہراس کی حالت طاری ہوجاتی ہے) اے آقا! میں توبہ کرتا ہوں اور اس غرض سے کہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کروں، وہ کلنک کا ٹیکہ جو میری پیشانی پر لگ چکا ہے خون کے سوا اور کسی چیز سے مٹایا نہیں جاسکتا میں آیا ہوں کہ آپ کی اجازت سے توبہ کروں۔ پہلے یہ فرمایئے کہ میری توبہ قبول ہے یا نہیں؟ امام حسینؑ ہیں جو اپنے لئے کچھ نہیں چاہتے حالانکہ یہ جانتے ہیں جناب حر توبہ کرے تو کیا اور نہ کرے تو کیا موجودہ حالات میں اس سے کوئی فرق پڑتا لیکن وہ

جناب حر کو اپنے لئے نہیں چاہتے خدا کے لئے چاہتے ہیں۔آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: بے شک تیری توبہ قبول ہے۔کیوں قبول نہیں ہوگی؟ کیا توبہ کرنے والے انسان کے لئے رحمت الٰہی کا دروازہ بند ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں!

جناب حر اس بات سے خوش ہو گئے کہ ان کی توبہ قبول ہوگئی **الحمد اللہ** میری توبہ قبول ہے؟ ہاں! تو مجھے اجازت دیجئے کہ میں جاؤں اور اپنے آپ کو آپ پر قربان کروں اور اپنا خون آپ کی راہ میں بہاؤں !امامؑ نے فرمایا: اے حر! تو ہمارا مہمان ہے،گھوڑے سے اتر،تھوڑی دیر بیٹھ تا کہ ہم تیری تواضع کریں (میں نہیں جانتا کہ امامؑ کس چیز سے تواضع کرنا چاہتے تھے) لیکن حر نے امامؑ سے سوار رہنے ہی کی اجازت چاہی آقا نے بہت اصرار کیا لیکن وہ گھوڑے سے نہیں اترے!

بعض تاریخ دانوں نے اس بات کے یہ معنی نکالے ہیں کہ جناب حر چاہتے تھے کہ امامؑ کی خدمت میں بیٹھیں لیکن انہیں ایک فکر بے چین کر رہی تھی وہ ڈر رہے تھے کہ جس عرصے میں وہ امامؑ کے پاس بیٹھے ہوں اگر امام حسینؑ کا کوئی بچہ انہیں دیکھ کر یہ کہہ اٹھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے پہلے دن ہمارا راستہ روکا تھا تو جناب حر کو شرمندگی ہوگی۔اس غرض سے کہ جتنی جلدی ہو سکے چہرے کی یہ سیاہی اپنے خون سے دھوڈالے انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے جانے کی اجازت دیجئے امامؑ نے فرمایا: اچھا تمہارا اصرار ہے تو میں نہیں روکتا۔جاؤ!

یہ بہادر لوگوں کے مقابلے میں کھڑا ہو جاتا ہے،ان سے گفتگو کرتا ہے۔کیونکہ خود بھی کوفی ہے ،اہل کوفہ سے دعوت (بلاوے) کا موضوع چھیڑتا ہے اور کہتا ہے: اے لوگو! یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں خود ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جنہوں نے خطوط لکھے تھے تم لوگوں میں سے اور تمہارے سرداروں میں سے جو یہاں موجود ہیں ان لوگوں نے آپؑ کو خطوط لکھے تھے،انہیں اپنے گھر بلایا تھا،انہیں سے مدد کا وعدہ کیا تھا۔اب کس اصول کی رو سے،کس قانون کی رو سے،کس مذہب اور دین کی روح سے اپنے مہمان سے ایسا سلوک کر رہے ہو؟

بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ ایک واقعہ نے اس شخص کو بہت ناراض کر دیا تھا یعنی ایک ایسی کمینگی اور پست حرکت جوان لوگوں نے دکھائی تھی،ایسی پستی جو انسانیت اور اسلام کی روح کی ضد ہے۔تاریخ اسلام گواہی دیتی ہے کہ اسلام نے کسی وقت اس کی اجازت نہیں دی کہ کسی دشمن کے ساتھ بھی ایسا سلوک

کیا جائے یعنی دشمن کو سخت دباؤ میں لا کر اس کا پانی بند کر دیا جائے۔ یہ تجویز حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے سامنے رکھی گئی تھی اور وہ یہ کام معاویہ کے سلسلے میں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ خود امام حسینؑ نے انہی جناب حر کو ان کے اصحاب کے ساتھ حالانکہ دشمن تھے راستے میں سیراب کیا تھا۔ جناب حر کو یقیناً یاد ہوگا کہ ہم نے اس شخص کا پانی بند کیا ہے جس نے ہماری پیاس کے دن ہماری درخواست کے بغیر ہمیں سیراب کر دیا تھا۔ وہ کتنے شریف، بلند اور بزرگ تھے اور ہیں اور ہم کتنے پست ہیں انہوں نے کہا: اے کوفہ والو! تمہیں شرم نہیں آتی! یہ فرات مچھلی کے پیٹ کی طرح چمک رہی ہے، یہ جو تمام موجود جانداروں کے لئے حلال ہے، اس سے انسان، پالتو، وحشی اور جنگلی جانور سب پانی پیتے ہیں، تم نے یہ پانی فرزند پیغمبرؐ کے لئے روک دیا ہے؟ یہ شخص لڑتے لڑتے شہید ہو جاتا ہے امام حسینؑ اسے انعام دیئے بغیر نہیں رہتے، فوراً اس بزرگ ہستی کے سرہانے پہنچتے ہیں۔ اس کے لئے آپ نے ایک جملہ فرمایا: "انت الحر کما سمتک امک و نعم الحر حر ریاح" کتنا ہے۔ اس کی ماں نے اس کا کتنا اچھا نام رکھا ہے۔ اس نے پہلے دن کہا حر، آزاد انسان یہ سچ ہے کہ تو آزاد انسان تھا۔ یہ حسینؑ ہے، عظیم اور شریف ہے، جہاں تک ہو سکتا ہے اپنے اصحاب پر مہربانی کرتا ہے۔ یہ خود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ امام حسینؑ جن لوگوں کے سرہانے پہنچے وہ کتنے مختلف تھے، ہر کسی کی ایک حالت ہوتی تھی۔ جس وقت امامؑ پہنچتے تھے ایک ابھی تک زندہ تھا اور آقا سے باتیں کر رہا تھا، دوسرا جانکنی کے عالم میں تھا۔

امام حسینؑ نے اپنے آپ کو جن لوگوں کے سرہانے پہنچایا ان میں سے کسی کی حالت آپ کے بھائی حضرت ابالفضل العباسؑ سے زیادہ دلخراش اور جاں سوز نہیں تھی۔ وہ بھائی جنہیں امام حسینؑ بہت چاہتے ہیں، بابا امیر المومنینؑ کی شجاعت کی یادگار ہیں ایک جگہ لکھا ہے کہ امام حسینؑ نے ان سے کہا تھا اے بھائی! "بنفسی انت" اے عباس! میری جان تم پر قربان ہو! یہ بہت اہم بات ہے۔ امام حسینؑ سے حضرت عباسؑ تقریباً پچیس سال چھوٹے تھے (ابا عبداللہ ۵۷ سال کے اور حضرت عباس ۳۴ سال کے جوان تھے) عمر اور تربیت کے لحاظ سے امام حسینؑ حضرت ابالفضلؑ کے باپ کے برابر شمار ہوتے تھے۔ اس وقت وہ ان سے کہتے ہیں۔ اے بھائی!! "بنفسی انت" میری جان تم پر قربان ہو۔

امام حسینؑ خیمے کے پہلو میں منتظر کھڑے ہیں۔ یکا یک حضرت ابالفضلؑ کی مردانہ فریاد سنتے ہیں (لکھا ہے کے حضرت ابالفضلؑ کا چہرہ اتنا حسین تھا کہ "کان یدعی بقمر بنی ھاشمؑ" کہ اپنے زمانے

میں قمر بنی ہاشم کے لقب سے مشہور تھے۔آپؑ کا قد اتنا بلند تھا کہ بعض مورخین نے لکھا ہے:"وکان یرکب الفرس المطھم ورجلاہ یخطان الارض" بلند گھوڑے پر سوار ہوتے تھے،رکاب سے پاؤں نکال لیا کرتے تھے تو زمین پر انگوٹھوں سے خط بنتا چلا جاتا تھا میں مانتا ہوں کہ بقول مرحوم آقا شیخ محمد باقر بیرجندی کچھ مبالغہ بھی ہوگا لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ جسم بہت بلند تھا ایسا جسم تھا جس پر نظر کرنے سے امام حسینؑ کو خوشی ہوتی تھی) جس وقت امام حسینؑ ان کے سرہانے پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کے جسم پر ہاتھ نہیں ہیں،انکے سر پر ایک آہنی گرز لگا ہوا ہے اور آنکھ میں ایک تیر پیوست ہے۔بے سبب نہیں ہے جو کہا گیا ہے:"لما قتل العباس بان الانکسار فی وجہ الحسن" جیسے ہی حضرت عباسؑ قتل ہوئے لوگوں نے دیکھا کہ امام حسینؑ کا چہرہ بے رونق ہوگیا۔آپؑ نے خود فرمایا تھا:"الآن انقطع ظھری وقلت حیلتی"

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم وصلی اللہ
علی محمد وآلہ الطاھرین

سوالات

۱۔ حسینی تحریک میں کونسا عامل سب سے زیادہ دخالت رکھتا ہے۔ مسئلہ طلب بیعت، کوفیوں کی دعوت یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر؟

۲۔ مندرجہ بالا تینوں عوامل میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی قدر و قیمت کیوں زیادہ ہے؟

۳۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی شرائط بیان کریں؟

۴۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مراحل و اقسام بیان کریں؟